بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

نظام پاکستان کے متعلق علامہ اقبال کا خط
قائداعظم مرحوم کے نام

آج مورخہ 12 ستمبر 2003ء کے اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ ایل ایف او پر مذاکرات میں ناکامی کی صورت میں ملک میں ایک نئے نظام کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں اور جنرل مشرف کے معاون اس سلسلے میں ان تھک کام کررہے ہیں۔ انگریزی جریدہ نیوز لائن کی ایک رپورٹ کے مطابق اس بات کا امکان غالب ہے کہ نیا نظام فرانسیسی طرز کا ہوگا جس میں ایگزیکٹو پاور صدر کے پاس ہوتی ہے اور انتظامیہ کی سربراہی وزیراعظم کرتے ہیں۔ اس قسم کی خبریں پاکستان میں آئے دن گردش کرتی رہتی ہیں۔ کبھی امریکی صدارتی نظام پر غور ہوتا ہے تو کبھی فرانسیسی نظامِ حکومت پر لیکن قرآنِ کریم پر کسی کی توجہ نہیں جاتی جو اسلامی آئین کا سرچشمۂ ابدی ہے، جس کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کا دیا ہوا ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ حصول پاکستان کے بعد، وہ پاکستان میں کس قسم کے نظام کا نفاذ چاہتے تھے؟ اس کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ اس خط میں واضح کیا تھا جو انہوں نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظم کے نام تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس خط میں پہلے یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہونا چاہئے اور اس کے بعد یہ کہ اگر ان کے تصور کے مطابق مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہوگئی تو اس کا نظام کن خطوط پر متشکل ہونا چاہئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''لیگ کو آخرالامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اسکی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں

دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی 1935ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آ جائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت، اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دوسو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے...... اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (Development) دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش (Subsistence) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشترا کی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشترا کی جمہوریت (Social Democracy) کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہو گا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جذبات کے بندی خانے سے نکلیے

جب تک ہم اپنی عقل کو منفی جذبات جیسے غصہ' انتقام' حسد اور اضطراب وغیرہ کی کنیز بنائے رکھیں گے اس وقت تک ہمیں منظر صاف نہیں دکھائی دے گا۔ جذبات کا شتر بے مہار کالی گھٹاؤں کی طرح ہے اور جب کالی گھٹائیں جوبن پر ہوں سورج چھپ جاتا ہے اور سورج کا چھپنا دوسرے لفظوں میں اندھیرے کا راج ہے۔ اندھیرے میں رسی سانپ بن کر دکھائی دیتی ہے اور رائی کا پہاڑ نظر آتا ہے زندگی کے معمولی مسائل غیر معمولی بن جاتے ہیں۔ اس لئے جذبات کے بندی خانے سے نکلنا اشد ضروری ہے۔ دنیا ہمارے ذہن میں (Subjectively) موضوعی اعتبار سے موجود نہیں بلکہ معروضی (Objectively) اعتبار سے موجود ہے۔ جذبات کو عقل کے ماتحت کام کرنا چاہئے اور عقل کو وحی کی روشنی میں۔ جذبات کی سرخ آندھی جب جوبن پر ہو تو متلی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ زندگی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ جذبات کی لال آندھی ہماری نظر بندی کر دیتی ہے اور ہمیں اپنے ناک سے آگے کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ پرندے کی طرح زندگی کا Aerial View لیں گے تو کوئی مسئلہ بھی آپ کے اعصاب پر سوار نہیں ہو گا جبکہ زندگی کو مکوڑے کی بینائی (Worm's Eye-view) سے دیکھیں گے تو چیونٹیاں ہاتھی بنتی جائیں گی۔ زندگی بحر بے کنار ہے لیکن منفی جذبات ہماری آنکھوں میں موتیا اتار دیتے ہیں اور پھر ہمیں زندگی ایک اندھے کنویں میں گری پڑی عالم بے بسی میں ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا شعور عموماً بے بسی' اکتاہٹ' ذہنی تناؤ اور شکست خوردگی کا شکار رہتا ہے کیونکہ وہ معمولی نوعیت کے حامل مسائل کی گرفت میں رہتا ہے۔ زندگی کی وسعتیں لاانتہا ہیں۔ عالمین لاتعداد ہیں اور کہکشائیں بے شمار ہیں۔ جو نظر آتا ہے وہ ہماری قوت بینائی کے محدود ہونے کی وجہ سے بہت ہی کم ہے سارے حجاب اس لئے ہیں کہ ہمارے حواس خمسہ حقیقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتے ہیں۔ ویسے بھی جزوی عقل کے سہارے حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ایسے ہی ہے جیسے کانٹے کے ساتھ سوپ پینے کی سعی لاحاصل کرنا۔ آپ سوچیں گے تو مطمئن رہے گے اور محسوس کریں گے تو نبض ڈوبنے لگے گی۔ حاصل کو پسند کر لیجئے' نعمتوں کو شمار کیجئے اور محرومیوں کی گنتی چھوڑ دیجئے۔ لمحوں کو دل کی چھلنی میں سے گزرنے دیجئے۔ دل کی چھلنی کو ناشکری کے ڈاٹ لگا لگا کر بند مت کیجئے کیونکہ لمحے اور لمحوں میں ہونے والے واقعات جب دل کی چھلنی میں جمع ہونا شروع کرتے ہیں تو پھر زندگی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ زندگی کے ہاتھ میں ہاتھ دیجئے۔ مسکراتی ہوئی زندگی آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے بس آپ نے اندر سے کنڈی کھولنی ہے۔

(عاطف طفیل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنویر مفتی، سویڈن

تبلیغی جماعتیں اور عیسائی مشنری

ایک جائزہ

یورپی ممالک اور خصوصاً حکومتِ برطانیہ دن بدن ویزا قوانین میں سخت رویہ اختیار کرتی چلی جا رہی ہے۔ اسلامی ممالک خصوصاً پاکستان سے یورپ آنے والوں کے لئے خاص چھان بین اور مہنگے دام کے عوض ویزا دیا جاتا ہے۔ لیکن باوثوق ذرائع کے مطابق پاکستان سے آنے والے تبلیغیوں کے لئے حکومت برطانیہ بلا چوں چرا ویزا دے دیتی ہے۔

یہ تبلیغی یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی آتے جاتے رہتے ہیں یہ ایک دلچسپ اور حیران کن مشاہدہ ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہ میری سمجھ میں آتی ہیں۔

(۱) ہوتا کچھ یوں ہے کہ پاکستان سے آنے والے یہ حضرات یورپ میں آباد دوسرے پاکستانیوں یا پھر اردو، پنجابی بولنے والوں میں اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ انہیں نماز، روزہ کی تلقین کرتے ملتے ہیں۔ یورپ کے لوکل لوگوں کو یہ کبھی ملتے ہی نہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کو خود بھی معلوم ہے کہ یورپی عوام بلا دلیل وشواہد کبھی کسی چیز کے قائل نہیں ہوتے۔ ان تبلیغیوں کے پاس ایسے دلائل سرے سے ہوتے ہی نہیں کہ یہ کسی یورپی کو اسلام کے لئے قائل کر سکیں۔ صرف جذباتی اور معجزاتی باتیں یورپیوں کے لئے انتہائی ناکافی ہیں۔ لہٰذا ان تبلیغیوں کا حلقۂ تبلیغ مسلمانوں تک ہی محدود ہے۔ یہ حقائق یورپی حکمرانوں کو معلوم ہیں۔ اول تو یورپی حکمرانوں اور نظام کو کسی ''مذہب'' سے کوئی خوف نہیں۔ سرمایہ داروں اور سرمایہ داری نظام کو اس سے قطعی کوئی دلچسپی ہے نہ خوف کہ اس کے لئے کام کرنے والے کس ''مذہب'' پر یقین رکھتے ہیں، ان کا ذاتی عقیدہ کیا ہے۔ ان کا مفاد یہی ہے کہ سرمایہ ان تک پہنچتا رہے اور کام کرنے والے ''اچھے شہری'' بنے اپنا کام کرتے رہیں۔ ٹیکس اور اپنے بل باقاعدہ ادا کرتے رہیں۔ جرائم نہ ہوں۔ اب اگر یہی کام تبلیغی حضرات کرنے آ جاتے ہیں تو یورپی حکمرانوں کے مفاد میں ہے۔ سرمایہ داری نظام کے مفاد میں ہے۔ اگر

عراق، افغانستان، ایران، پاکستان ویسے کرتے رہیں جیسا یورپی وامریکی سرمایہ دار چاہتے ہیں تو ان پر کبھی کوئی عتاب نہ آئے گا۔ جیسے سعودی عرب اور امارات کے دوسرے ممالک ہیں۔ یہ ممالک بیشک ''اسلامی'' رہیں۔ ایسے ذاتی عقائد سے سرمایہ دار کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کچھ ریاستوں میں سیاہ فام اسلامی تنظیم The Nation of Islam کے سرگرم رہنے سے جرائم کی شرح میں واضح کمی ہوئی ہے۔ جیلوں میں سیاہ فام قیدیوں کے اسلام قبول کرنے کی اطلاعات ہیں اور اس طرف بھی نشاندہی کی جا رہی ہے کہ یہ قیدی جیلوں سے رہا ہونے کے بعد اکثر اچھی زندگی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بہت کم ہی دوبارہ جرم کرتے ہیں۔ متعلقہ ریاستوں کی حکومتیں اس طرزِ عمل سے بہت خوش ہیں اور اس اسلامی تنظیم کے کام کو سراہا بھی جا رہا ہے اور اس کا حلقہ پھیل بھی رہا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کو لوگوں کے ذاتی عقائد یعنی مذاہب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن سرمایہ دار اس پتے کو اپنے مفاد میں وقت پڑنے پر استعمال کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ شاید یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ تبلیغی بہ آسانی ویزا لے کر یورپ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان پر کوئی روک ٹوک نہیں۔

(۲) دوسری بڑی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ جب یورپی اقوام ادھر سے آنے والے تبلیغیوں پر پابندی عائد نہیں کرتی تو اسلامی ممالک کے حکمرانوں کو عیسائی تبلیغیوں کے لئے دروازہ کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ دوستو! مجھے یقین ہے کہ عیسائی مشنریز ہمارے تبلیغیوں سے 50 گنا زیادہ موثر طریقہ سے کام کر رہے ہیں۔ یہ مشنری ہمارے تبلیغیوں کی نسبت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور باقاعدہ نپے تلے پلان کے تحت اسلامی ممالک کے غریب لوگوں تک رسائی رکھتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے نامور بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو نے بتایا ''تقریباً سو سال سے اوپر ہوئے سفید فام لوگ افریقہ آئے۔ انہوں نے افریقیوں کو کہا کہ ہاتھ آگے پھیلائیں اور آنکھیں بند کرلیں۔ جب ہم نے آنکھ کھولی تو بائبل ہمارے ہاتھ میں تھی، افریقہ وہ لے گئے۔''

سویڈن میں ہی چھپنے والی ایک کتاب کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیں صرف سویڈن سے 14 مذہبی یا نیم مذہبی مشنری آرگنائزیشن (Organizations) اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ یہ کیا کام کر رہے ہیں، کیا اس کی کسی کو خبر ہے؟ کیا ان پر کوئی کنٹرول یا چیک ہے؟ مزید اعداد و شمار یہ ہیں: بنگلہ دیش میں 24، فلسطین میں 20، افریقی ملک سوڈان میں 10، اریٹیریا میں 15، سینیگال میں 7 اور اس کے علاوہ مصر، انڈونیشیا، صومالیہ، گیمبیا، تیونس، عراق میں بھی سویڈن کہ اتنے ہی تبلیغی ادارے سرگرم عمل ہیں۔ یاد رہے کہ سویڈن مغربی یورپ میں واقع 90 لاکھ نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ جس کی اتنی بڑی تبلیغی اداروں کی مقدار اسلامی ممالک میں سرگرم عمل ہے۔ یورپ کے باقی ممالک اور امریکہ، آسٹریلیا اور دوسرے ممالک سے کتنے تبلیغی ادارے مسلم ممالک میں ہوں گے اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے۔

تبلیغی اداروں کے یہ ممبران سال ہا سال گرم مرطوب علاقوں کے ممالک میں رہتے ہیں۔ یوں ایک تو یورپ کی شدید سردی سے جان بچتی ہے دوسرے انہیں جو توجہ' آرام و آسائش اور دوسری خدمات وہاں کے لوگوں سے ملتی ہیں وہ انہیں اپنے ممالک میں نہیں ملتیں۔ برسوں ان ممالک میں رہنے کے باوجود یہ وہاں سے کچھ بھی نہیں اپناتے۔کیونکہ ان کا مشن ہی یک طرفہ ٹریفک کی مانند ہے کہ دوسروں کو اپنے جیسا بنایا جائے' اپنا عقیدہ اپنی سوچ' اپنا کلچر' اپنی روایات کا دوسروں کو قائل کیا جائے اور ان کا کچھ بھی نہ اپنایا جائے۔ اس مشن میں یہ ہمارے مسلمان تبلیغیوں کی نسبت بہت زیادہ کامیاب ہیں۔ ہمارے سادہ لوح اور پیار کرنے والے لوگ بہ آسانی قائل ہو جاتے ہیں۔

میری نظر میں کسی بھی صورت میں تبلیغ کا یہ طریقہ اور اسلوب مناسب نہیں ہے۔ مدد بے لوث ہونی چاہئے اور ضرورت نظام کو درست کرنے کی ہے نہ کہ لوگوں کے عقیدوں کو بدلا جائے۔کسی ایک عقیدہ کے لوگوں کی تعداد یا مقدار سے کچھ بڑا فرق نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے تبلیغی کارکن اگلے سو سال میں مسلمان عقیدہ کے لوگوں کی تعداد عیسائیت سے زیادہ بڑھانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو؟ اسلام کا پھیلنا اور مسلمانوں کی تعداد کا بڑھنا شاید دو مختلف چیزیں ہیں۔۔۔؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلطان محمود

ہمارا معاشرہ اور جنسی بے راہ روی

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا o انا هدينه السبيل اما شاكرا واما كفورا o

بیشک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لئے پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا ہم نے اسے راہ دکھائی اور خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا۔(76:2-3)

مندرجہ بالا آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدائش کے وقت جو صلاحیتیں دیں ان کے استعمال کو انسان کی Choice پر چھوڑ دیا کہ چاہے تو انسان ان صلاحیتوں کو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر بھرپور استعمال کر کے اپنی ذات کو فائدہ پہنچائے یا چاہے تو ان صلاحیتوں کو اپنے خود غرضانہ مفادات کی چکی میں پیس دے یعنی انسان خدا کی عطا کردہ صلاحیتیں تعمیری عوامل کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے اور تخریبی عوامل کے لئے بھی۔ ہاں البتہ دونوں قسم کے استعمال کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا یعنی

قد افلح من زكٰها o وقد خاب من دسها o (92:9-10)

جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ خسارے میں رہا۔

یہ نتیجہ اس گواہی کے بعد نکلے گا جو غلط استعمال شدہ صلاحیتیں انسان کے خلاف دیں گی۔ اس گواہی کی طرف قرآن مجید یوں اشارہ کرتا ہے۔

يوم تشهد عليهم السنتهم وايديهم وارجلهم بما كانوا يعملون (24/24).

اس دن جبکہ ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

یعنی یہ Facilities جو کہ اللہ نے دین کی سربلندی اور اپنی ذات کے نشو و ارتقاء کے لئے انسان کو دیں تھیں اور جن کا صحیح استعمال کر کے انسان نے دنیا و آخرت کو سنوارنا تھا وہی Facilities اس کے لئے تباہی کا باعث بن جائیں گی۔ کیونکہ اس نے انہیں خدا کے مقرر کئے ہوئے قانون کے مطابق استعمال نہیں کیا تھا اور اپنی خواہشات کو سامنے رکھ کر ان کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔

اب ان ہی God gifted facilities میں سے

ایک جنسی جذبہ بھی ہے۔

یہ جذبہ کن وجوہات کی بناء پر پیدا ہوتا ہے اور اس کا تعمیری اور تخریبی استعمال انسان کیسے کر سکتا ہے انہی سوالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اپنی بحث کو آگے بڑھاؤں گا۔

سب سے پہلے تو یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جنسی جذبہ مرد وعورت دونوں میں موجود ہے اور اسی جذبے کے تحت نسل انسانی کی بقا ممکن ہے اور اگر یہ جذبہ نہ ہو تو خطہ ارض انسانوں سے بالکل خالی ہو جائے۔

عورت ہمارے سامنے ماں، بہن، بیٹی، بھتیجی، بھانجی، پوتی، دوہتی، بیوی اور بحیثیت انسان آتی ہے۔ ان حیثیتوں میں سے پہلے سات رشتے تو خونی رشتے ہیں جو کہ خود بخود بنتے ہیں اور انسان کی Choice کا اس میں دخل نہیں ہوتا جبکہ بیوی کا رشتہ عموماً By choice ہوتا ہے اور جذبات کی لڑی میں پرویا ہوتا ہے لیکن جتنا اہم یہ رشتہ ہوتا ہے اور کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

دوسری طرف اگر ہم عورت کو محض عورت کی حیثیت سے دیکھیں تو جو نفسانی خواہشات ہمارے اندر پیدا ہوتی ہیں وہ اس Mental Setup کے زیر اثر پیدا ہوتی ہیں جس کے تحت ہم عورت کو دیکھتے ہیں یا اس انداز نظر سے پیدا ہوتی ہیں جس کے زیر اثر دماغ کی تاریں چھڑتی ہیں اور پھر پورا جسم شہوانیت کا مرقع بن جاتا ہے۔ گویا نظر کی بے باکی شہوانیت کو جنم دیتی ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے قرآن مجید یہ راہنمائی مہیا کرتا ہے۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذالک ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون o(24:30)

مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں خدا ان سے خبردار ہے۔

یعنی نظر کی حفاظت شرمگاہ کی حفاظت کی پہلی کڑی ہے۔ اس لئے مومنین کے لئے حکم ہے کہ نظر کو بے باک نہ ہونے دیں تا کہ کہیں خدا کی حدود کو Cross کر لیں اور بات آگے تک جا پہنچے۔

مندرجہ بالا آیات سے اگلی آیت میں مومن عورتوں کے لئے بھی یہی حکم ہے لیکن ایک اضافہ کے ساتھ اور وہ یہ کہ اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں اور سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کی جسمانی ساخت میں اللہ تعالیٰ نے کشش رکھی ہے اگر اس ساخت کی نمود و نمائش کو حدود میں نہ رکھا جائے تو یہ چیز معاشرے میں فساد کا باعث بن سکتی ہے جیسا کہ مغربی معاشرے کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں عورتیں لباس کا صحیح استعمال بھلا چکی ہیں اور لباس پہننے کا مقصد صرف جذبات کو پروان چڑھانا رہ گیا ہے نہ کہ جسم کو ڈھانپنا۔ اسی نمائش جسم کی وجہ سے بے پناہ دراڑیں اس معاشرے کے اندر در آئی ہیں۔ جیسا کہ وہاں کا خاندانی نظام اسی وجہ سے بالکل درہم برہم ہو چکا ہے بہت کم لوگوں کو اپنے صحیح نسب کا علم ہے۔ بوڑھے والدین کی فیملی میں حیثیت صرف بوجھ جیسی رہ گئی ہے اس لئے ان کے لئے علیحدہ Homes بنائے جاتے ہیں۔ آزادی خیال کے نظریے کو اپنا کر معاشرے میں Rational Animal کی طرح لوگ رہتے ہیں اور یہ Rational Animals ہمیشہ اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہیں چاہے اس مفاد کے لئے دوسروں کے

حقوق کو پامال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ قانون اخلاقیات ایک دقیانوسی قانون کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حدود کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہے۔

مغرب میں Spiritual Development نہ ہونے کے برابر ہے۔ جبکہ Material Development زور و شور پر ہے۔ لیکن قرآن مجید اس Material Development کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین کانو من قبلهم۔ کانوا هم اشد منهم قوة واثار فی الارض فاخذهم الله بذنوبهم وما کان لهم من الله من واق o(40:21)

کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی تا کہ دیکھ لیتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا وہ قوت اور زمین میں اپنی نشانیاں بنانے کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی بھی بچانے والا نہ تھا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ مادی ترقی کر لینا ہی حصول فلاح کے لئے کافی نہیں اگر یہ مادی ترقی اللہ تعالیٰ کی حدود کو Cross کر کے کی جائے تو آخر یہی تباہی کا باعث بن جاتی ہے کیونکہ قانون مکافات درجہ بدرجہ آگے بڑھتا ہے اور مہلت پوری ہونے پر سب کچھ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔(28:44-45)

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے ہمارے نوجوانوں کے قلب ونظر کی پاکیزگی چھین لی ہے اور ان کی آنکھوں سے مقصد حیات کو اوجھل کر دیا ہے۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

خیر یہ تو چلتے چلتے مغربی دنیا کا ذکر چھڑ گیا اب دوبارہ سورہ نور کی آیات کی طرف آتے ہیں آپ دیکھیں کہ چوبیسویں آیت میں مردوں اور پچیسویں آیت میں عورتوں کو اپنی نظر کو کنٹرول میں رکھنے کا کہا گیا ہے۔ خدا نے پہلے مرد کو پاکیزگی کی دعوت دی اور پھر عورت کو۔

جوہر مرد عیاں ہوتی ہے بے منت غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

اسلامی معاشرہ ہمیشہ مردوں کے رویے سے بنتا ہے اور مردوں کے رویے ہی عورتوں کے رویوں کو Channelize کرتے ہیں۔ مرد ہی عورت کی نسوانیت کا نگہبان ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ نگہبانی نہ کرے تو معاشرہ فحاشی وعریانی کے جنگل میں آ جائے اور ہر طرف جنسی بے راہ روی کے مواقع آسانی سے میسر آ جائیں اور آخر کار تباہی و بربادی اس معاشرے کا مقدر بن جائے۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اب اگر ہم پاکستانی معاشرے میں مرد کے کردار کا جائزہ لیں تو فحاشی وعریانی اور جنسی بے راہ روی کا ذمہ دار عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے اسے طعنے دیئے جاتے ہیں کہ وہ بن سنور کے نکلتی ہے اور اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے اور اس طرح مردوں کے 'چٹان سے مضبوط ایمان' کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ لیکن اگر ذرا ٹھہر کر یہ دیکھا جائے کہ عورت کیوں اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے؟ تو ہمیں بات کو عورت کی پیدائش سے شروع کرنا ہوگا جب کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو عموماً کس قسم کے رویے ہمارے معاشرے میں سامنے آتے ہیں؟ قرآن مجید بڑے واضح الفاظ میں ان رویوں کی عکاسی کرتا ہے وہ یوں کہ

واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھه مسوداً وھو کظیم o یتوری من القوم من سوء ما بشر به ایمسکه علی ھون ام یدسه فی التراب الاساء ما یحکمونo

جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے تو اس کا چہرہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو وہ اندوہناک ہو جاتا ہے اور اس خبر بد کی وجہ سے جو وہ سنتا ہے لوگوں سے چھپا تا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بری ہے۔

اب آپ ہی سوچیں کہ جس جنس کو اپنی پیدائش ہی سے اس قسم کے رویوں کا سامنا کرنا پڑے تو کیا اس میں احساس ندامت اور احساس کمتری پیدا نہ ہوگا؟ اور پھر یہی جنس اپنی وقعت کو معاشرے کی نظروں میں بڑھانے کے لئے قرآن کے احکامات کو جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے پس پشت ڈال کر دورِ جاہلیت کی اقدار کی تجدید کرتی ہے۔(33:33)۔

مرد و عورت کے باہمی تعلق کو قرآن مجید نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ وہ (عورتیں) تمہارا لباس ہیں اور تم (مرد) ان کا لباس ہو۔ یعنی مرد و عورت ایک دوسرے کی Protection اور Comfort کے لئے ہیں جیسے لباس یہ دونوں ضرورتیں پوری کرتا ہے اسی طرح مرد و عورت بھی ایک دوسرے کی دونوں ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جنسی جذبہ چونکہ ایک قدرتی امر ہے اور انسان کو بہرحال اس سے واسطہ پڑتا ہے تو پھر اس جذبے کو صحیح سمت میں کیسے Channelize کیا جا سکتا ہے؟ وہ صحیح سمت ہے نکاح جبکہ اس کے مقابلے میں غلط سمت بدکاری ہے۔

نکاح کرنا ذمہ دارانہ رویے کا ثبوت دینا ہے اور نکاح ہی معاشرے کے صحیح Setup میں پہلا قدم ہے۔ قرآن اس کو میثاقاً غلیظاً سے مشابہت دیتا ہے۔ ایک مضبوط عہد نہ کہ محض جنسی جذبے کی تسکین جو کہ نکاح کا ایک جزوی مقصد ہے۔ نکاح کا کلی مقصد ایک اچھے معاشرے کی بنیاد فراہم کرنا ہے۔

دوسری طرف صرف جنسی خواہشات کی تسکین ہی مطمح نظر ہوتی ہے اور بے راہ روی کا معاشرے میں دور دورہ ہوتا ہے۔ اخلاقی بدحالی عروج پر پہنچتی ہے اور خاندانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور معاشرہ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے تشکیل پاتا ہے اور بہت جلد

منہدم ہو جاتا ہے۔

جن سوالوں کو لے کر چلے تھے میں نے اپنی علمی سطح کے مطابق کوشش کی ہے کہ ان کے جواب دے دوں مگر اس گفتگو سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ صرف مرد ہی معاشرے کے جنسی بگاڑ کو قابو کر سکتے ہیں اگر عورت مرد کے ساتھ تعاون نہ کرے گی تو اکیلا مرد معاشرے کو نہیں سدھار سکتا۔ عورت کو ذمہ داری سے مبرا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مرد و عورت دونوں ہی اپنے آپ کو Reevaluate کریں اور Self Indulgency سے چھٹکارا پا کر اپنی ترجیحات کو قرآنی احکامات کی رو سے ترتیب دیں تو کچھ دور نہیں کہ قلب ونظر کی پاکیزگی ہمارے معاشرے میں پھلتی پھولتی ملے اور دنیا گروہ در گروہ اس پاکیزہ معاشرے کی طرف لوٹے اور ہمارے معاشرے کو دوسروں کی امامت کا شرف حاصل ہو اور معاشرے کے ہر ذمہ دار شخص کی زبان سے یہ دعا نکلے۔

ربنا هب لنا من ازواجنا و ذريتنا قرة اعين واجعلنا للمتقين اماماo(25/74)

اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

طلاق: ایک عام فہم مسئلہ

اسلامی نظریاتی کونسل نے سفارش کی ہے کہ ایک ہی نشست میں ایک ساتھ تین طلاقیں دینے کو قانوناً جرم قرار دیا جائے اور حکومت اس سلسلہ میں مناسب قانون سازی کر کے اس کے لئے سخت سزائیں لاگو کرے۔ کونسل نے سفارش کرتے ہوئے کہا قرآن مجید کے احکامات کے مطابق پہلے فریقین باہم مشاورت اور بات چیت سے مفاہمت کی کوشش کریں اور ناکامی کی صورت میں قرآن پاک کے احکامات کی روشنی میں معاملات کو طے کیا جائے۔ نیز طلاق رجعی کے بارے میں معلومات کو عام کیا جائے۔ طلاق رجعی کی صورت میں میاں بیوی کو ایک جگہ رہنے پر قانوناً پابند کیا جائے تاکہ فریقین کو رجوع کرنے کا موقع مل سکے۔

ہماری رائے میں کونسل کی محولہ بالا سفارشات روح اسلام یعنی قرآنی تعلیمات کے کافی حد تک مطابق ہیں' لہٰذا ان پر عملدرآمد کے لئے قانونی ضوابط کی تشکیل نہایت ضروری ہے۔ بات تو دوستو! بہت آسان تھی مگر اندیشۂ عجم نے زیب داستاں کی آبرو رکھنے کے لئے اسے جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے! عائلی زندگی کے باب میں وہ کون سی جہت ہے جسے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہے' ایک بھی نہیں۔ قرآن اور صاحب قرآن نے ایک ایک تفصیل فراہم کر دی ہے' اب یہ بعض ہٹ دھرموں کے بے جا ضد ہے کہ صدیوں سے اڑے ہوئے ہیں' زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ اگر نکاح کے لئے فریقین کا بالغ ہونا شرط قرار پا گیا تو یہ مصر ہو گئے نہیں جی ہم تو نومولودوں کی شادیاں کر کے رہیں گے اور پھر ''اتحاد کی برکات'' سے مستفید ہوتے ہوئے بچوں کو گود میں اٹھائے ہوئے بعض رہنما میدان میں آئے اور ان شیرخواروں کو رشتہ ازدواج میں باندھ کر سرخرو ہو گئے۔ اسی طرح میاں بیوی کے بیچ علیحدگی کے لئے جو قانون اترا اسے پس پشت پھینکتے ہوئے اپنا ہی اصول تراش لیا کہ ایک ہی بار' طلاق' طلاق' طلاق اگر حضرت خاوند کے دہن مبارک سے ادا ہو گیا تو فریقین کے درمیان علیحدگی ہو گئی' اب ان کے از سرِ نو ملن کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے ''حلالہ''۔ اب اس کی جزئیات کیا بیان کریں کہ اتنی شرمناک ہیں' قلم بھی جھینپ جاتا ہے۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ شروع سے علمائے حق بھی موجود رہے ہیں جو دین کی حقیقی روح کو پورے اخلاص کے ساتھ عوام الناس پر برابر واضح کرتے رہے ہیں۔ نکاح و طلاق کو ہی لے لیجئے' دونوں کے متعلق قرآن نے برابر کے حقوق کی شرائط پر

معاہدے کو باندھنے اور تنسیخ معاہدہ کا اختیار فریقین کو یکساں عطا کیا ہے تاکہ کسی کے ساتھ بے عدالتی' ناانصافی نہ ہو۔ اگر دونوں مل کر جینا چاہتے ہیں تو انہیں پورا حق حاصل ہے لیکن اگر بوجوہ دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا مل کر زندگی گزارنا ممکن نہیں تو وہ اس معاہدے کو منسوخ بھی کر سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک ناخوشگوار صورتحال ہوتی ہے لیکن قرآن کا منشاء ہے کہ آنے والی ان گنت ناخوشگواریوں سے بہرحال انسان کو بچایا جائے۔ سواس نے اجازت دی اور ایک فطری اور احسن ضابطہ بتا دیا کہ لوگو! تم اپنے وقتی جذبات اور ہیجان کو اپنا معبود نہ بنالو یعنی ''اگر تم میاں بیوی میں باہمی اختلاف' جھگڑے یا مخالفت وعداوت کا خدشہ محسوس کرو تو تمہیں چاہئے کہ ایک ثالث شوہر کے کنبے سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کنبے سے اگر یہ پنچ خلوص نیت سے کوشش کریں گے کہ میاں بیوی میں صلح صفائی کروادیں تو اللہ (یعنی اس کا نظام رحمت) میاں بیوی میں موافقت کے سامان پیدا کر دے گا لیکن اگر یہ ثالث اس نتیجہ پر پہنچیں کہ پانی سر سے گزر چکا ہے اور حالات اس درجہ کشیدگی اختیار کر چکے ہیں کہ میاں بیوی کی باہمی موافقت ناممکن ہے تو اس کے بعد عدالت علیحدگی کا فیصلہ دے دے گی۔''

آپ نے دیکھا' کس قدر فطری بہاؤ ہے قرآن سے ماخوذ اس مفہوم میں' یہ نہیں کہ ''نہیں تو نہ سہی والی'' لٹھ سر پر دے ماری۔ اب آگے اس کے کُل مرحلوں کو ایک ایک کر کے بیان کر دیا ''اے نبی ﷺ جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کی مدت پوری کرنے کے لئے طلاق دو۔'' یعنی طلاق کے عمل کی ابتدا اس سٹیج سے ہی متعین ہوگی جہاں سے عدت کا تعین واضح ہو اور پھر وہ مرکزی نکتہ واضح کیا جس پر اس سارے پروسس کا انحصار ہے۔ ''اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔'' اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض نہ آتا ہو۔'' ''اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ زمانہ عدت میں طلاق پانے والی عورت بجز اپنے سابقہ شوہر سے کسی اور سے نکاح میں نہیں بندھ سکتی۔ ''اس زمانہ عدت میں ان کے خاوند انہیں واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔'' لیکن اگر بالفرض دونوں ازسرنو مناکحت کی رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور مدت عدت اختتام پذیر ہو جاتی ہے تو پھر عورت مکمل آزاد ہے جس کے ساتھ چاہے نیا نکاح کرے۔ لیکن یاد رہے دوبارہ نکاح کی صورت میں ان کے پاس ایک طلاق کا موقع استعمال ہو گیا یعنی آئندہ زندگی میں وہ کبھی لڑ پڑتے ہیں' علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو ان کے پاس اب تین نہیں دو ہی چانس اور ہوں گے اور جنہوں نے دو مواقع استعمال کر لئے' ان کے متعلق قرآن کا کہنا ہے ''طلاق دو مرتبہ (ایسی ہی ہوتی ہے جس میں) چاہے بطریق معروف اس عورت کو رکھ لیا جائے یا بہ حسن سلوک اسے رخصت کر دیا جائے۔'' جب معاملہ یہاں پر پہنچ جاتا ہے تو پھر گویا احوال آخری فیصلے کو چھونے لگتے ہیں اس حوالے سے ایک مفکر قرآن لکھتے ہیں۔ ''اب دوسری مرتبہ کی طلاق (اور تیسری مرتبہ کے نکاح) کے بعد انہیں Warn کر دیا جاتا ہے کہ یہ لیلا بار بار نہیں رچائی جا سکتی۔ زندگی مذاق نہیں' سنجیدہ حقیقت کا نام ہے۔ اب بھلے مانسوں کی طرح زندگی کی کشتی کو کنارے تک لے جاؤ اور اس مرتبہ بھی تم نے آپس میں

نباہ کی صورت پیدا نہ کی اور پھر رشتہ مناکحت کو منقطع کر لیا تو یاد رکھو اس تیسری بار کی طلاق کے بعد یہ عورت تمہارے نکاح میں نہیں آ سکے گی۔ نہ دوران عدت' نہ اس کے بعد۔ اس لئے اب کے فیصلہ کرو تو سوچ سمجھ کر کرو۔''

صاحبو! ہمیں تو مذکورہ بزرگ کا نقطہ نظر ہی قرآنی منشاء کے مطابق محسوس ہوا ہے' اور ہماری یہ تحریر اسی بزرگ کے بیان فرمودہ معارف قرآن سے روشنی پائے ہوئے ہے۔ طلاقیں بلاشبہ تین ہی ہیں مگر ایک ہی بار یہ لفظ تین مرتبہ ادا کر دینے سے شوہر بیوی میں نکاح کا تعلق ٹوٹ نہیں جاتا' جو ایسا کرتے ہیں وہ یقیناً ظالم ہیں' عورت اس سے شدید بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ رشتہ ایسا کچا دھاگا نہیں کہ یونہی ٹوٹ جائے اور تاسف و ندامت کے باوصف دونوں کو دوبارہ ملنے کی اجازت بھی نہ ہو اور ایسا بھی نہیں کہ ایک ضابطے کے مطابق جب کُل مرحلوں سے گزر کر ہر طرح سے سوچ سمجھ کر میاں بیوی علیحدہ ہو جائیں تو پھر یہ کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا توڑ دیا جب چاہا جوڑ لیا۔ تمدن کی اساس میں اگر قوانین کی قوتیں کارفرما نہ ہوں تو معاشرے اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں نہ اعلیٰ قدروں کے منظرنامے کو وہاں پل بھر کی حیات ہی نصیب ہوتی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''دن'' لاہور' 11 جون 2003ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

اطاعتِ رسول کا قرآنی طریقہ

غلبہٗ واقتدار صرف ذات باری تعالیٰ عز اسمہ کے لئے مخصوص ہے اور وہ ہی ذات والا صفات اس کا مستحق ہے اسی لئے قرآن کریم ہی اس کی جملہ صفات عالیہ میں سے ایک صفت العزیز ۲۰/۱۲۵ بیان فرمائی گئی ہے اور یعنی ساری کائنات میں غلبہ و اقتدار اس کے قانون کو حاصل ہے اور کوئی طاقت ایسی نہیں ہے، جو اس کے قانون پر غالب آجائے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے طبعی قوانین بھی شامل ہیں اور انسانی معاشرہ کے قوانین بھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً وحی الٰہی کے ذریعے انسانیت کو ملتے رہے۔ انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ ہر اس قوم کو حاصل ہوسکتا ہے جو اس نظام کے تحت قوانین خداوندی کے مطابق معاشرہ تشکیل کرے۔ وللہ العزۃ و للرسولہ وللمومنین ولکن المنٰفقین لا یعلمون ۶۳/۸۔ حالانکہ عزت تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے مگر منافقین نہیں جانتے نیز فرمایا من کا یرید العزۃ فللہ العزۃ جمعیا ۳۴/۸، جو شخص بھی عزت کا خواہاں ہو تو (خدا سے مانگے) کیونکہ ساری عزت تو خدا ہی کی ہے۔ اسی کے نظام سے وابستگی میں ہی عزت و غلبہ ہے۔ قرآن کریم کے یہ دعاوی صرف نظری ہی نہیں تھے۔ بلکہ صدر اول میں حضور علیہ السلام اور آپ کے عالی مقام ساتھیوں نے قرآن کریم کے ان دعاوی کی صداقت کو عملاً ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور نہایت پروقار مضبوط معاشرہ قائم کیا کہ جس کے سامنے اس دور کے سارے باطل نظام پر مبنی معاشرے مغلوب و عاجز ہوگئے۔ اس معاشرہ کے غالب اور مقتدر ہونے کی اصل وجہ اس معاشرہ کی وہ Ideology، وہ نظام حیات، وہ کلمۂ طیبہ تھا جس پر اس معاشرے کو قائم کیا گیا تھا اور جس کو بحیثیت مجموعی جاری کیا گیا تھا۔ قرآن کریم کا انتباہ ہے کہ نظام حیات قابل انقسام (Divisible) نہیں ہوتا۔ اس پر کلی طور پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ ادخلوا فی السلم کافتہ ولا تتبعوا فطوت الشیطن ۲/۲۰۸۔ ایمان والو تم سب ایک بار اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو اور اگر نظام حیات کے حصے بخرے کئے تو اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو افتومنون ببعض الکتب وتکفرون ببعض نعما جزاء من یفعل و ذالک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا ۲/۸۵، کیا تم

کتاب خدا کی بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو۔

لیکن بدقسمتی سے چونکہ مسلمانوں میں ملوکیت در آئی اس لئے اس نظام حیات کا بحیثیت مجموعی جاری ہونا ناممکن ہو گیا۔ ملوکیت تو خود قرآن کریم کے نظام کے بالکل خلاف ہے۔ اس میں تو قرآنی نظام کا جاری ہونا بالکل دو متضاد چیزیں تھیں۔ ملوکیت کے ابتدائی دور میں معاشرہ اپنے (Momentum) (قوتِ درونی) کے زور پر چلتا رہا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس میں زوال شروع ہوا۔ ملوکیت کو جو کچھ نقصان انسانیت کو پہنچانا تھا اس سے تو مفر ہی نہیں تھا۔ لیکن یہ توقع تھی کہ ملوکیت کی گرفت کمزور ہو جانے کے بعد پھر اس نظام کو دوبارہ جاری کیا جا سکتا تھا لیکن جس چیز سے اس سے بھی زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا وہ ملوکیت کی وہ سازش تھی جس میں اس نے اس نظام حیات کی بنیادی اصول ہی تبدیل کر دیئے اور جس کی بناء پر دوبارہ اس نظام کا قیام ہی ناممکن ہو گیا۔ یہ قرآنی نظام اور اصل الاصول اور اساس محکم یہ تھا کہ اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اور انسان اور اللہ تعالیٰ کا تعلق صرف اس نظام کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ اس میں انسان اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی اور نجی تعلق کی بالکل نفی ہو جاتی تھی۔ یہ نظام زندہ ہونا چاہئے، محسوس اور عملی شکل میں اس کے قوانین کا اجراء ہونا چاہئے۔ یــــا ایھـــا الـذیـن امـنـوا اطیـعـوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عـنـہ وانـتـم تسمعون ۔(ترجمہ) اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔ اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ وہ نظام ایسی عملی شکل میں موجود ہو کہ اس سے روگردانی کا امکان موجود ہو۔ اسی لئے اس سے روگرانی کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے اور اسی نظام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت گردانا گیا ہے لیکن چونکہ اس نظام کے قائم کرنے میں ملوکیت کو اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے اس نے نہ صرف اس نظام کو ہی ختم کر دیا بلکہ اس نظام کے کبھی بھی قائم ہونے کا امکان ہمیشہ ہمیشہ لئے بالکل ختم کر دیا۔ اور اللہ و رسول کی اطاعت کا قرآنی تصور ہی بدل دیا۔ جس سے نظام قائم کرنے کا ذرا بھی امکان باقی رہتا اور یہ نظریہ قائم کیا کہ اللہ و رسول کی دو اطاعتیں ہیں جن کا عملی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور احادیث کی اطاعت سے رسول ﷺ کی اطاعت ہوتی ہے اور چونکہ یہ اطاعتیں ذاتی اور نجی طور پر ہر معاشرے میں ہو سکتی ہیں، اس لئے اس نظام کے برپا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں اور اس طرح ملوکیت نے اپنا تحفظ فراہم کر لیا اور یہی مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا دائمی سبب ہوا اور اسی وجہ سے آج تک ہم مسلمانوں میں تباہی و بربادی مسلط ہے اور مختلف ممالک میں ملوکیت بھی قائم ہے کیونکہ نظری حیثیت سے ملوکیت کا جواز موجود ہے اور جب تک ہم مسلمان اس نظریہ پر نظر ثانی نہیں کریں گے، نہ ملوکیت کا نظام ختم ہو گا، اور نہ ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اور جب تک اللہ و رسول کی اطاعت قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق نہیں ہو گی ہم مسلمان کسی طرح بھی غلبہ و اقتدار حاصل نہیں کر سکیں گے۔

اللہ و رسول کی اطاعت کا قرآنی طریقہ اس کے نظام کی اطاعت اور ان دونوں اطاعتوں کو ایک شمار کرنا ہے۔ یہ حقیقت

قرآن کریم میں اس قدر واضح اور تاکید کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان مقامات کو توجہ سے دیکھنے کے بعد اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن کریم نے اللہ و رسول کے الفاظ اپنی اصطلاح کے طور پر بیان فرمائے ہیں۔ جس سے حکومت اسلامی کا اقتدار اعلیٰ مراد ہے اور یہ کہ یہ ایک اطاعت ہے۔

(۱) یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑ دیا تھا جو کہ انہوں نے حضورﷺ کے ساتھ کیا تھا۔ اس عہد توڑنے کو اللہ و رسول کی مخالفت قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ مخالفت نظام اسلامی کی مخالفت تھی۔

ذلک بانھم شاقو اللہ و رسولہ' ومن یشاق اللہ فان اللہ شدید العقاب (۵۹/۴)۔

(ترجمہ) یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے خدا اور رسول کی مخالفت کی اور جس نے خدا کی مخالفت کی تو خدا بڑا عذاب دینے والا ہے۔

(۲) ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرہ واعد لھم عذابا مھینا (۳۳/۵۷)۔ بے شک جو لوگ اللہ کو اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر خدا نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لئے رسوائی کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اگر اللہ سے مراد اللہ کی ذات اور رسول سے مراد رسول کی ذات لی جائے تو آیت کبھی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ کیونکہ حضور کو تو ایذاء پہنچائی جا سکتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کو کون ایذاء پہنچا سکتا ہے۔ اس کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس آیت میں مراد نظام خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

(۳) یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین (۹/۲)۔

یہاں اللہ و رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ یرضوہ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان والو منافق تمہیں راضی کرنے کے لئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں' حالانکہ اللہ اور رسول زیادہ حقدار ہے کہ اگر وہ مومن ہیں تو اس کو راضی رکھیں یعنی قرآنی نظام کے وفادار رہیں۔ اب بات واضح ہے کہ اللہ اور رسول کے لئے ضمیر واحد آئی ہے۔ لیکن اللہ و رسول ایک نہیں۔ اللہ اللہ ہے' رسول رسول ہے۔ خالق و مخلوق ایک نہیں ہو سکتے۔ پس اللہ اور رسول کے لئے واحد ضمیر ہی لا کر' اور انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے جملہ اللہ اور رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایسی چیز کے لئے لایا گیا ہے جو ایک ہے' دو نہیں ہیں۔

(۴) برأۃ من اللہ و رسولہ الی الذین عاھد تم من المتشرکین (۹/۱)

جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح) کا معاہدہ کیا ہے۔ ان کے لئے اللہ و رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔

(۵) وآذان من اللہ و رسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین و رسولہ۔

اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے

بری الذمہ ہے۔

(۶) کیف یکون للمشرکین عقد عنداللہ و عند رسولہ الا الذین عاھدتم عندالمسجد الحرام۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مشرکوں کا عہد ''اللہ اور اس کے رسول'' کے نزدیک عہد ہوتا ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب عہدو پیمان باندھا تھا۔

یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ ہیں۔لیکن انہیں اللہ و رسول کے معاہدات کہا گیا ہے۔اس وضاحت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ اس نکتہ کی طرف مرکوز کی جائے کہ اگر چہ یہ تمام احکامات رسول اللہ کی طرف سے جاری ہو رہے تھے لیکن درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات ہیں' اس لئے کہ یہ اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے جاری ہو رہے ہیں۔

(۷) اس سلسلہ میں سورہ النساء کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ صحت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے ارشاد ہوتا ہے ومن یخرج من بیتہٖ مھا جرا الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفورا رحیما (۴/۱۰۰)

(ترجمہ) اور جو شخص اپنے گھر سے جلاوطن ہوکر خدا اور اس کے رسول کی طرف نکل کھڑا ہوا پھر اسے (منزل مقصود تک پہنچنے سے پیشتر) موت آجائے تو خدا پر اس کا ثواب لازم ہے اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ اور رسول کے معنی اسلامی حکومت کے علاوہ اور ہو ہی نہیں سکتے۔

ان مندرجہ بالا مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ و رسول سے مراد اسلامی حکومت ہے اور اس کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہے اور رسول اللہ کی اطاعت کرنے کا یہی قرآنی طریقہ ہے لیکن ہمارے ہاں ملوکیت کے دور کا مروجہ طریقہ رسول اللہ کی اطاعت کا یہ ہے کہ حدیث کے اتباع سے رسول اللہ کی اطاعت ہوتی ہے' جو قرآنی طریقہ سے بالکل متضاد ہے اس وقت سب سے اہم نکتہ جو نہایت غور و فکر کا متقاضی ہے وہ یہی ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کرنے کا قرآنی طریقہ کیا ہے۔ایک طریقہ تو یہ ہے جو راقم سطور کمترین نے سابقہ سات آیات کریمات سے واضح کیا ہے کہ حضور کی اطاعت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام جس کو عملاً حضورﷺ نے متشکل کر کے دکھایا تھا' اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی' کیونکہ یہ نظام کوئی وقتی یا ہنگامی طور پر قائم نہیں کیا گیا تھا۔اس لئے اس نظام کی اطاعت ہی ہمیشہ اللہ و رسول کی اطاعت گردانی جائے گی۔وکیف تکفرون وانتم تتلیٰ علیکم ایت اللہ وفیکم رسولہ ومن یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم (۳/۱۰۱)۔(ترجمہ) اور تم کیونکر کافر بن جاؤ گے (حالانکہ) تمہارے سامنے خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور اس کے رسول بھی تم میں موجود ہیں اور جو شخص خدا سے وابستہ ہو وہ تو ضرور سیدھی راہ پر لگا دیا گیا ہے۔

اس آیت مجیدہ میں فیکم رسولہ کے الفاظ غور طلب ہیں۔اس کے یہ معنی نہیں کہ حضورﷺ کی حیات تک تو تم ہدایت پر رہو گے اور پھر تم ہدایت سے پھر جاؤ گے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم کیسے کفر کر سکتے ہو جبکہ قوانین خداوندی تمہارے پاس

موجود ہیں نیز یہ کہ ان قوانین کو عملی طور پر چلانے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی تمہارے درمیان موجود ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے تم کفر نہیں کر سکتے۔ اس آیت کریمہ اور آیات وانتم تسمعون واذا دعا کم لما یحییکم (۸/۲۴) سے واضح ہے کہ وہ اتھارٹی زندہ ہے جس کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں یہ نظریہ ہے کہ فیکم رسولہ سے مراد حدیث وروایات ہیں اور عملاً روایات کی اطاعت سے ہی رسول کی اطاعت کی جاتی ہے۔ موجودہ جمع شدہ روایات کے نہ تو الفاظ ہی حضورﷺ کے ہیں، نہ ہی حضورﷺ کے دور میں مدون ہوئیں۔ نہ ان کو حضورﷺ کی سند حاصل ہے، نہ ان سے زندہ اتھارٹی کا تصور ملتا ہے۔ تو ان کی اطاعت سے حضور کی اطاعت کیسے ہوسکتی ہے۔ ان سے صرف رواۃ کرام کی اطاعت تو ضرور ہوتی ہے، جن کے الفاظ میں وہ روایات مروی ہیں، حضورﷺ کی اطاعت ان سے قطعاً نہیں ہوتی۔

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں آیت کریمہ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (۳/۳۰)، ان سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ خدا (بھی) ہم کو دوست رکھے گا، تلاوت کی جاتی ہے اور اس آیت سے اتباع رسول کے بارے میں کتب وروایات کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے اور اس پر اصرار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ ان اتبع الا ما یوحی الی (۶/۵۰) میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے اوحی الی هذا القران۔ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ دونوں آیات کی ترتیب سے واضح ہے کہ حضور صرف قرآن کا اتباع فرماتے تھے اور اصل متبوع وحی الٰہی ہے جس کے تابع خود حضور تھے۔ اسی طرح اگرچہ حضورﷺ ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے درمیان میں اصل متبوع وحی الٰہی یعنی قرآن کریم اپنی منزہ شکل میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ بس آیت مندرجہ بالا میں اتباع رسول کی صورت میں اتباع قرآن کا حکم دیا گیا ہے، کتب روایات کے اتباع کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ دین کا دارومدار یقینیات پر ہوتا ہے اس کا دارومدار ظنیات پر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ یقینی چیز کا اتباع کا حکم ہوتا ہے۔ ظنی چیزوں کے اتباع کا حکم اس سرکار سے مل ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ خود ارشاد الٰہی ہے ان الظن لا یغنی من الحق شیئا اس آیت کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظن کے اتباع کا حکم نہیں مل سکتا۔ روایات ظنی ہیں اور اس زمرہ میں شامل ہیں، اس لئے ان کے اتباع کا حکم کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں مل سکتا۔

اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ۔ حضور اکرمﷺ کو حکم ہوا کہ ملت ابراہیم کا اتباع اختیار کریں۔ ثم اوحینا الیک ان اتبع ملت ابراہیم حنیفا (۱۶/۱۲۳)، پھر ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرو۔ اس آیت کریمہ میں تو صرف حضرت ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن دوسری جگہ سورہ انعام میں متعدد انبیاء کرام حضرات اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، یسوع، یونس، لوط، ان سترہ انبیاء کرام کے نام گنوانے کے بعد حکم ہوا کہ اولئک الذین

ھدی اللہ فبھدا ھم اقتدہ (۶/۹۰)' یہ (انبیاء کرام) وہ لوگ تھے جن کی خدا نے ہدایت کی' پس تم بھی ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

اب ظاہر ہے کہ حضورﷺ کے پاس نہ تو حضرت ابراہیم کے دور کی روایات موجود تھیں اور نہ ہی ان تمام سترہ انبیاء کرام کے ادوار کی احادیث موجود تھیں' لیکن اس کے باوجود حضور کو ان کی ہدایت کی پیروی کا حکم دیا گیا اور یقیناً یقیناً حضورﷺ نے ان تمام انبیاء کرام کی ہدایت کی پیروی فرمائی۔ تو کیا وہ پیروی حضورﷺ نے ان انبیاء کرام کی احادیث کی رو سے کی تھی' قطعاً نہیں۔ عقلاً یہ بات قابل تسلیم نہیں ہوسکتی۔ سنت اللہ یہی رہی ہے کہ وحی الٰہی کی تعلیم نوح علیہ السلام سے لے کر حضور تک ایک ہی رہی ہے۔ جب حضورﷺ نے اپنے پر نازل شدہ وحی کا اتباع کیا' تو ان سابقہ انبیاء کرام کی وحی کا بھی اتباع اس میں شامل ہوگیا۔ مایوحی اورما انزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہوتا ہے۔ جس طرح حضور نے مایوحی کا اتباع کرکے جملہ انبیاء کا اتباع کیا ہے' اسی طرح ہم بھی اگر مایوحی کا اتباع کریں گے تو یہ حضورﷺ کا ہی اتباع ہوگا اور یہ اتباع قرآن کریم کے طریقہ کے مطابق ہونے کے علاوہ' حضورﷺ کی سنت کے مطابق بھی ہو گا کہ حضور خود بھی انبیاء کرام کا اتباع اسی طرح فرماتے تھے اور جن حضرات کو حضور کی سنت پر عمل کرنے پر اصرار ہے' یہ طریقہ ان کے مفاد کے مطابق ہے۔ اس طرح نہ تو حضورﷺ نے روایات کی طرف توجہ فرمائی' اور نہ ہی اب مسلمانوں کو ان کی طرف توجہ دینے کی احتیاج ہے۔ و فتدبروا۔

اس سلسلہ میں اسوۂ حسنہ کے متعلق بھی یہ تصور دیا جاتا ہے کہ چونکہ حضورﷺ کی زندگی ہم سب کے لئے ایک مثالی زندگی ہے' اس لئے حضورﷺ کی حیات مبارکہ کے تمام احوال وکوائف ہمیشہ پیش نظر رکھنے چاہئیں اور ان پر شب و روز عمل پیرا ہونا چاہئے۔

اس سے بھی احادیث کا سہارا لیا جاتا ہے کہ احادیث کے بغیر حضورﷺ کا اسوۂ حسنہ اختیار نہیں کیا جا سکتا اور آیت کریمہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ (۳۳/۲۱)۔ اس کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ حضورﷺ کے اسوہ حسنہ کے لئے احادیث کی ضرورت ہوتی ہے' کیونکہ بعینہ یہی الفاظ دو مرتبہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے لئے بھی بیان کئے گئے ہیں کہ اے مسلمانو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ساتھیوں کی زندگی تمہارے لئے ایک مثالی زندگی ہے۔ فرمایا قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذقالوا لقومھم انا برء وامنکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم و بدابیننا وبینکم العداوۃ والبعضآء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ (۶۰/۴)۔ اے مسلمانو تمہارے واسطے تو ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا اچھا نمونہ (موجود) ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہؤ بیزار ہیں۔ ہم تو تمہارے (دین کے) منکر ہیں اور جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ ہمارے تمہارے درمیان کھلم کھلا عداوت و دشمنی قائم ہوگئی ہے۔ نیز دو ہی آیات کے بعد ارشاد ہوا۔ لقد کان لکم فیھم اسوۃ حسنۃ لمن کان

یرجوا اللہ والیوم الآخر (۶/۶۰)۔(مسلمانو) ان لوگوں کا تمہارے واسطے جو خدا اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو' اچھا نمونہ ہے۔قرآن کریم نے نہ صرف حضرت ابراہیم بلکہ ان کے ساتھیوں کی زندگی بھی ہمارے لئے اسوۃ حسنہ قرار دی ہے۔لیکن قرآن کریم نے خود ہی بیان فرما دیا کہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کا جو عمل قابل نمونہ ہے وہ ان کا منکرین دعوت قرآنی کے ساتھ تعلقات منقطع کرنا ہے اور ان سے کھلم کھلا دشمنی اختیار کرنا ہے' اور یہ کہ غیر مسلموں کو دوست نہیں بنایا جا سکتا اور ان سے تعلقات نہیں رکھے جا سکتے۔ یہ نظریہ اور اس پر خود حضرت ابراہیم کا' اور ان کے معزز ساتھیوں کا عمل پیرا ہونا' ہم سب مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

بالکل اسی طرح ہمیں حضور کے اسوہ حسنہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ جنگ احزاب کا واقعہ ہے کہ جب مصائب اور مشکلات اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھیں باہر سے دشمن کی مخالفت سیلاب بلا کی طرح امنڈ کر آ رہی تھی اور اندر سے منافقین کی فریب کاریاں قدم قدم پر پریشانی کا موجب بن رہی تھیں اور ان حالات میں ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر کر رہا تھا۔ لیکن ان حالات میں بھی حضورﷺ روشنی کے مینار کی طرح جم کے کھڑے رہے' اور ان کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہ آنے پائی۔ رسول اللہ کی یہ استقامت' سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لئے وجہ سکون واطمینان تھی اور نیز یہ کہ ہر اس شخص کے لئے بہترین نمونہ تھی (اور ہے) جو خدا اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو' اور خدا کی یاد بکثرت کرتا ہو۔ جو اللہ تعالیٰ کے قانون کی ہمہ گیری اور نتیجہ خیزی پر یقین کامل رکھتا ہو اور مستقبل کی زندگی کی خوشگواریوں پر جس کی نگاہ ہو اور جو ہر وقت قانون خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہو۔ جس نمونہ کی وضاحت قرآن کریم نے خود اپنی آیات میں فرما دی' ان میں احادیث وروایات کا سہارا لینے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی۔ حضورﷺ کا جو اسوہ حسنہ امت کے لئے واجب الاتباع ہے وہ قرآن کریم نے خود ہی بیان فرما دیا ہے اور یہ آیات کریمات بھی منجملہ ان آیات کے ہیں۔ جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے مایوحی اور ما انزل کا اتباع ہی حضور کا اتباع ہے اور اس کے لئے خارج از قرآن روایات کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ یہاں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ہماری احادیث میں جو احادیث حضورﷺ کے اسوہ حسنہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں' ان کا بیشتر حصہ حضور کے ذاتی معمولات' اور نجی معاملات سے متعلق ہے جس کا تعلق نہ تو دین سے ہے اور نہ ہی ان کا اتباع امت پر لازمی ہے اور بیشتر ان میں سے ایسی بھی ہیں جو انبیاء کرام اور خود حضورﷺ کی سیرت کو بہتر طریقہ پر پیش نہیں کرتیں اور آیت مبارکہ ولکم فی رسول اللہ اسوۃ سے یہ دلیل دینا کہ ان کو جمع کرنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے' درست نہیں ہے۔ حضورﷺ کے ذاتی معمولات' شب و روز کے اعمال کا اتباع مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ اس لئے ان احادیث کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور جو اسوہ حسنہ حضورﷺ کا واجب الاتباع ہے وہ خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے اور اپنی دفتین میں محفوظ کر دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی نے بہت وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

''جو امور آپ نے عادتاً کئے ہیں' ان کو سنت بنا دینا اور تمام انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو

اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔" (رسائل مسائل حصہ اول صفحہ۳۰۰)۔

نیز لکھا ہے:

"تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی ﷺ تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی علیہ السلام نے ان اصولوں کی پیروی کرنے کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر، جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہیں تھا۔" (رسائل وسائل حصہ اول ص ۳۱۷)۔

مولانا صاحب محترم کے اقتباسات صرف بطور استشہاد پیش کئے گئے ہیں جو اکثر حضرات کے لئے سند نہیں ہیں، اور مولانا نے بھی اپنی تائید کے لئے کوئی آیت کریمہ بھی پیش نہیں فرمائی ہے۔ اس لئے اپنے موقف کے ثبوت کے لئے قرآن کریم کی آیت بطور حجت پیش کی جاتی ہے۔

سورہ الممتحنہ میں ارشاد ہوا۔ یا ایھا النبی اذا جاء ك المومنت یبا یعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یشرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولاد ھن ولا یا تین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن و ارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبا یعھن واستغفر لھن اللہ ان اللہ غفور رحیم (۶۰/۱۲)۔

(ترجمہ) اے رسول جب تمہارے پاس ایمان دار عورتیں تم سے اس بات پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ نہ کسی کو خدا کا شریک بنائیں گی اور نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالیں گی، اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں کے سامنے کوئی بہتان گھڑ کے لائیں گی اور نہ کسی نیک کام میں تمہاری نافرمانی کریں گی، تو تم ان سے بیعت لے لو۔ اور خدا سے ان کی مغفرت کی دعا مانگو بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کریمہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ قانونی معاملات میں حضور ﷺ کا اتباع لازمی ہوگا۔ اور ذاتی رائے کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ یہاں قرآن کریم نے معروف کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا ترجمہ و مفہوم راقم کمترین نے قانونی معاملات تحریر کیا ہے۔ معروف قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جس سے مراد قرآنی حکومت کے قوانین ہیں۔ نیز کسی بھی معاشرہ کی رسم و رواج، جو پیشتر سے چلی آ رہی ہوں۔ اگر قرآنی حکومت ان کو اختیار کرے، تو وہ بھی قرآنی قوانین کے زمرہ میں آ جائیں گی۔ قرآنی حکومت کے جملہ احکامات معروف ہیں اور اس کی اطاعت ہر شہری پر فرض ہوگی۔ اگر کوئی شہری کسی طریقہ سے، اپنے اثر و رسوخ سے، قوانین کی گرفت سے بچ جائے، تو یہ ممکن ہے، لیکن اللہ و رسول کے ہاں اس کا جو مواخذہ ہوگا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔ مثلاً سرکاری دفاتر اگر 9 بجے صبح شروع ہوتے ہیں تو یہ قانون اسلامی حکومت کا معروف ہے اور ہر ملازم پر فرض

ہے کہ وہ 9 بجے حاضر ہو' کوئی ملازم' افسران بالا سے مل کر' اس پابندی سے انحراف کر سکتا ہے لیکن جو مواخذہ اس اسلامی حکومت کی نافرمانی کا اس کے نفس پر مرتب ہوگا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔ یہی وہ اساس محکم ہے جس کی بناء پر اسلامی حکومت اپنے momentum پر رواں دواں رہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ معاشرہ جنت بداماں ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی نافرمانی' اللہ و رسول کی معصیت ہوتی ہے اس میں جرم اور گناہ' Sin اور Crime ایک ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ مذہبی شخص جو گناہ نہیں کرتا' وہ جرم بھی نہیں کرے گا' جو زکوۃ کی ادائیگی پابندی سے کرتا ہے' وہ (قرآنی حکومت میں) انکم ٹیکس بھی اسی طرح یہ سمجھ کے ادا کرے گا کہ اس کا ادا کرنا بھی زکوٰۃ کی طرح فرض ہے' اور اس کے ادا نہ کرنے سے گناہ ہوگا اور اللہ و رسول کی نافرمانی ہوگی۔ مندرجہ ذیل آیات کریمات سے معروف کا مفہوم اور واضح ہو جاتا ہے۔ آپ قرآن کریم کے نسخے سے یہ آیات ملاحظہ فرمائیں۔ (۲/۲۴' ۴/۱۱۴' ۲۲/۲' ۶/۶۵' ۹/۱۱۲' ۹/۱۱۲)

معروف کے معانی واضح ہونے کے بعد سابقہ آیت کریمہ سورہ ممتحنہ کا مفہوم اور واضح ہو جاتا ہے کہ حضور کا اتباع معروف یعنی اسلامی حکومت کے احکامات وقوانین میں لازمی اور ضروری ہے۔ لیکن ذاتی رائے کی پابندی ہم پر لازم نہیں۔ اگر حضورﷺ کسی دن چاول نوش فرماتے تھے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ مدینہ منورہ میں جملہ صحابہ اس دن چاول ہی تناول فرماتے' اس میں ہر شخص کی ذاتی آزادی برقرار تھی' کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کھانا کھا سکتا تھا۔ اس میں حضورﷺ کا اتباع لازمی نہیں تھا۔

جیسا کہ شروع مضمون میں عرض کیا گیا ہے کہ ملوکیت سے جو نقصان اسلام اور مسلمانوں کو ہوا' وہ ملوکیت کے مفقرض ہونے کے بعد قابل تلافی تھا۔ مگر ملوکیت کے دوران اسلام کے بنیادی نظریات میں جو تبدیلی کی گئی ہے' وہ اب تک ہمیں سخت نقصان پہنچا رہی ہے۔ یہ نقصان ہمارا خود فراہم کردہ ہے' اب جبکہ ملوکیت کے انقراض کو عرصہ ہو گیا ہے' ہم مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ قرآن کریم کو سامنے رکھیں اور اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ متعین کرلیں۔ یہ بھی ایک خوش آئند بات ہے کہ تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے علمائے قرآن نے آواز بلند کی۔ اور اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ واضح طور پر امت کے سامنے پیش کر دیا۔ تقریباً ۶۰ سال سے تحریک طلوع اسلام اس نظریہ کی بھرپور اشاعت کر رہی ہے۔ اب اس نظریہ پر خالی الذہن ہو کر' دل جمعی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ علمائے کرام کی سہولت کی خاطر ساری بحث کا ملخص پیش خدمت ہے۔

(۱) اطاعت رسول کا ایک طریقہ جو ہم میں برسوں سے متوارث چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ روایات کی اطاعت سے رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس میں کسی مقام' وقت' کی تخصیص نہیں۔ ہر شخص ہر خطۂ زمین میں قرآن کے ذریعے اللہ کی اور احادیث کے ذریعے حضورﷺ کی اطاعت کر سکتا ہے۔ اس میں نہ مسلمانوں کے اپنے الگ ملک کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسلامی حکومت کی۔ جو حضرات ہر وقت عشق رسول میں سرشار اور محبت رسول میں غلطاں و پیچاں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ حضور کے عطا کردہ قانون کو عملاً نافذ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ انگریز کے دور میں بھی قانون انگریز کا نافذ تھا۔ قرآن کے قوانین کا کسی جگہ اجراء نہیں

تھا۔لیکن یہ حضرات عشق رسول کے مدعی بھی تھے اور حضور کے اطاعت کنندہ بھی۔

(۲) اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ یہ ہے کہ صرف ''اسلامی حکومت'' کی اطاعت کرنے سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے، جیسا کہ سابقہ آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ صرف ایک اطاعت ہوتی ہے۔حضورﷺ کے دور میں ان کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہو رہی تھی۔حضور کے بعد جو بھی ''اسلامی حکومت'' کا سربراہ ہوگا اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی۔اس میں اسلامی حکومت کا قیام لازمی ہے۔اسلام کی رو سے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس نظام کی معرفت ہوتا ہے۔اسلام میں اللہ تعالیٰ سے ذاتی، نجی تعلق کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن چونکہ ہم مسلمان ملوکیت میں رہے، پھر انگریز کا طویل دور رہا۔اس لئے یہ تصور ختم ہوگیا۔کیونکہ اس وقت اسلامی حکومت کا قیام مشکل بھی تھا اور اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ بھی فراہم نہیں ہوسکتا تھا۔

اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔جو تحریکیں اسلام کے نظام کی داعی ہیں، انہیں ضرور اس درخواست پر غور کرنا چاہئے کہ اگر اللہ و رسول کی اطاعت قرآن و حدیث سے ہوسکتی ہے تو اسلامی نظام کے قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے۔اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت تو صرف اس صورت میں ہوتی ہے کہ اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ اختیار کیا جائے اور اسلامی حکومت قائم کر کے اس کی اطاعت کی جائے۔اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے استقلال کے لئے تو اساس محکم ہی یہ ہے کہ اس سے اور صرف اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ورنہ اس کے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔جہاں تک حضورﷺ سے محبت کا تعلق ہے۔ظاہر ہے کہ ہر شخص حضورﷺ سے محبت کرتا ہے اور عقیدہ رکھتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صاحبزادہ انورالحق وفا

(ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم)

بزم طلوع اسلام فیصل آباد کے سرپرست عاشق قرآن ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم ایم۔بی۔ڈی۔ایم۔آر۔ای' ایم۔ایس۔سی۔پی۔بی سابق میڈیکل سپریٹنڈنٹ سرجن 16 جون 1916ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے اور 88 سال کی عمر میں 11 جولائی 2003ء کو 23 سی' پیپلز کالونی' فیصل آباد میں انتقال فرما گئے۔مجسمہ زہد وایثار' پیکر تقدس وتقویٰ' منبع فضائل وکمالات ڈاکٹر حیات مرحوم کے ساتھ میری پہلی ملاقات 31 دسمبر 2002ء کو ہوئی اور آخری ملاقات 5 جولائی 2003ء کو ہوئی یعنی میری انکے ساتھ رفاقت صرف 6 ماہ 11 دن کی ہے لیکن اس مختصر سی مدت میں ہمارا ایسا تعلق قائم ہوا جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔فکر قرآنی سے منسلک ہر مخلص شخصیت میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ پھر انسان انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم نے مری اور سیالکوٹ کی بزموں کی نمائندگی کرنے کے بعد ایک طویل عرصہ فیصل آباد کی بزم کی سرپرستی اس انداز سے کی گویا حق ادا کردیا۔اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ فیصل آباد میں فکر قرآنی کے فروغ واحیاء میں ان کا حصہ سب سے بڑھ کر رہا۔حیات ملک ایک شخص نہیں بلکہ مفکر قرآن علامہ پرویز مرحوم سے فیض یافتہ ایک شخصیت تھی جس کا اثر تھا کہ میں انہی کا ہو کر رہ گیا۔

نہ جانے کس ادا سے میری جانب اس نے دیکھا تھا
ابھی تک دل میں تاثیرِ نظر محسوس ہوتی ہے

ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم نے اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیت دین اسلام کے لئے وقف کر رکھی تھی اور آپ دین اسلام کی حمایت کے لئے ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے۔انسانوں کی بے لوث خدمت خصوصاً غریبوں اور حق داروں کے ساتھ ان کا برتاؤ قابل دید ہوا کرتا تھا لیکن حیات کی وفات کے بعد اب منظر کچھ ایسا ہے۔

فضائے لالہ و گل میں وہ تازگی نہ رہی
وہ کیا گئے کہ بہاروں میں دلکشی نہ رہی

ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم بلا مبالغہ وسعت علم' وسعت مطالعہ' وسعت ظرف' زکاوت طبع اور زکاوت حس میں اپنی نظیر آپ تھے۔رب العالمین مولانا اللہ جل جلالہ نے انہیں پاکیزہ سیرت' بلند وعالی ہمت اور مکارم اخلاق وصفات کے ایسے انمول خزانے سے سرفراز فرمایا تھا کہ ان کی شخصیت اخلاقی بلندی کی معراج کو پہنچ گئی تھی۔آپ انہیں شرافت ونسب کے اعتبار سے دیکھیں یا آدمیت و انسانیت کے نقطۂ کمال کی نگاہ سے الغرض جس پہلو سے بھی دیکھیں گے جس معیار پر بھی پرکھیں گے بلندیوں کی چوٹیوں پر پائیں گے۔

28 مارچ 1968ء کے دن کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جس روز قرآن کے سرگشتگانِ شوق فیصل آباد کے ہوائی اڈے پر بے تابانہ مفکر قرآن علامہ پرویزؒ کا انتظار کر رہے تھے اور جب عرصہ دراز کے بعد سرزمینِ فیصل آباد نے میرِ کارواں کے قدم چومے تو مفکر قرآن کی منزلِ مقصود ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم کا دولت کدہ 23 سی' پیپلز کالونی تھا۔اس کے بعد مفکر قرآن

نے 10 بجے صبح سٹیزن ہوٹل میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بزم طلوع اسلام کا تعارف کرایا اور اسلام کے معاشی نظام پر تفصیل سے خطاب کیا۔ 8 بجے شام ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم کی صدارت میں مفکر قرآن نے اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں کے موضوع پر بصیرت افروز خطاب فرمایا۔ اگلے روز 29 مارچ کو صبح 11 بجے بار ایسوسی ایشن سے اسلام میں فکر کا مقام کے موضوع پر مفکر قرآن نے خطاب کیا اور شام 4 بجے 23 سی' پیپلز کالونی ہی میں عاشقان قرآن نے مفکر قرآن کو اپنا تعارف کرایا اور سوالات پیش کئے اور پھر ریلوے اسٹیشن سے الوداع کیا۔ مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کے باوجود مفکر قرآن کا دوروزہ کامیاب دورہ کروانا ان کا تاریخی کارنامہ تھا۔

ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم کی خدمت میں ایک روز میں نے ماہنامہ البلاغ کراچی کا شیخ الحدیث مفتی سبحان محمود نمبر پیش کرتے ہوئے کہا اس میں موصوف کا ایک مضمون ہے ''حفاظتِ قرآن اوراس کے مختلف طریقے'' جس میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے آیات کلام ربانی پتھر کی سلوں' چمڑے کے پارچوں' کھجور کی شاخوں' بانس کے ٹکڑوں' درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں البتہ کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال فرمائے گئے۔ (عمدۃ القاری) اس کے متعلق روشنی ڈالیں تو کہنے لگے یہ خیال جو عام طور پر مروج ہے کہ موجودہ مصحف سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا مرتب فرمودہ ہے اور آپ ہی جامع القرآن ہیں صحیح نہیں ہے۔ قرآن یوں پانچوں چیزوں پر نہیں لکھا گیا بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے خود اسے کتابی شکل میں مرتب کیا لہٰذا آپ ہی جامع القرآن تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ناشر قرآن تھے۔ قرآن کاغذ پر کتابی صورت میں لکھا گیا اس کی دلیل یہ ہے۔

''شہادت ہے اس کتاب (تورات) کی جو طور پر الواح میں (یعنی تختیوں پر) لکھی گئی تھی۔ اور شہادت ہے اس کتاب (قرآن) کی جو جھلی کے کشادہ اوراق پر سطر وار لکھی جاتی ہے۔'' (الطّور 52:1 تا 3)۔

ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم سے میری آخری ملاقات وفات سے 6 روز قبل 5 جولائی 2003ء کو محترم غلام نبی کے ہمراہ ہوئی۔ انہوں نے بتایا صاحبزادہ انوار الحق وفا نے علامہ پرویزؒ کے دفاع میں ایک مضمون ''مولوی جی اب بس کریں'' لکھا ہے تو حیات کے چہرے پر یکا یک رونق آ گئی اور مجھے کہا میری عینک دیں میں نے اٹھا کر دی تو بیماری کی حالت میں مطالعہ کرنے لگ گئے پھر میں نے انہیں ''عاشقِ قرآن ڈاکٹر محمد حیات ملک'' کے عنوان سے انہی پر لکھا ہوا مضمون دیا تو مسکرائے اور رکھ لیا اور میں محترم غلام نبی کے ہمراہ دفتر آ گیا۔ اس کے 6 روز بعد 11 جولائی 2003ء کو شام 5 بجے داعی قرآن محترم محمد شریف لون نمائندہ بزم طلوع اسلام فیصل آباد نے یہ المناک خبر سنائی کہ عاشق قرآن ڈاکٹر محمد حیات ملک مرحوم ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ 23 سی' پیپلز کالونی پہنچا محمد شریف لون' غلام نبی' حکیم عبدالمجید' ڈاکٹر محمد صدیق' محمد ارشد' میاں ریاض' میاں ارشاد' مہر محمد تاج' شفقت بٹ' محمد اسلم' محمود شاہ' محمد بشیر' محمد اسلم' رانا ناظر خان' محمد فیاض' عقیل حیدر' محمد ایاز عمر اور دیگر سینکڑوں سوگواروں کے ہمراہ رات پونے دس بجے اپنے مشفق بزرگ اور عظیم سرپرست کی نماز جنازہ ادا کی۔ میری زندگی کا یہ انوکھا اور منفرد سفر آخرت تھا کہ میں نے کسی مرد اور عورت کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھا بلاشبہ یہ عاشق قرآن کی تربیت ہی کا اثر تھا۔ جب ہم اپنے عظیم سرپرست کو سپرد خاک کر رہے تھے تو مجھے یہ آواز سنائی دی۔

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

چارٹ

لوحِ قرآنی

الٓمٓ	حٰمٓعٓسٓقٓ	نٓ
الٓمٓصٓ	حٰصٓہ	یٰسٓ
کٓھٰیٰعٓصٓ	قٓ	اٰمین

’’اس کے دیکھنے والوں کی سب مشکلیں آسان ہوجائیں گی صبح اس کو دیکھ کر جو کام بھی شروع کیا جائے پورا ہوگا اور غیبی طریقوں سے رزق کی دولت آنے لگے گی۔انشاءاللہ۔‘‘

لوحِ قرآنی کے عنوان سے مندرجہ بالا چارٹ اور تحریر میری نظر سے گذری ممکن ہے آپ نے بھی کہیں نہ کہیں اسے دیکھا ہو۔ یہ حروف قرآن کی مختلف سورتوں کے ابتدا میں آتے ہیں۔ انہیں مقطعات کہا جاتا ہے۔یعنی الفاظ میں سے قطع کردہ حروف۔ یہ بالعموم خدا کی صفات (الاسماء الحسنٰی) سے متعلق الفاظ میں سے اخذ کردہ حروف ہیں۔ان کے کوئی باطنی معانی نہیں نہ ہی کوئی معمہ ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔

البتہ چارٹ کے تیارکنندہ نے ایک تو چارٹ پر اپنا نام اور پتہ نہیں لکھا دوسرے اپنے قارئین کے لئے ایسا معمہ بنانے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق (چارٹ کا متن ملاحظہ ہو) (۱) اس کی طرف دیکھنے والوں کی سب مشکلات آسان ہوجائیں گی۔ (۲) صبح اس کو دیکھ کر جو کام بھی شروع کیا جائے گا پورا ہوگا۔ (۳) اور غیبی طریقوں سے رزق کی دولت آنے لگے گی۔انشاءاللہ۔

کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔اس سے قطع نظر ایک بات یقینی ہے۔کہ چارٹ پر جو نام نہاد حقائق سامنے لائے گئے ہیں۔قرآنی تعلیمات کی روح کے خلاف ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ:

(۱) ’’خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔‘‘(۱۱/۳)۔

(۲) ’’جس طرح اس شخص کی آرزو اور کوشش رائیگاں جاتی ہے جو دور سے پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر سمجھے کہ پانی اس کے منہ تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ حالانکہ پانی اس طرح اس کے ہونٹوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔‘‘ (۱۳/۱۴)۔

(۳)   ''اس کے ہاں اصول یہ ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔'' (۳۰/۱۷)۔

تاریخ کے حوالہ سے اگر بات کی جائے تو صدر اول کے مسلمانوں نے جس قدر قوت' حشمت' دولت وثروت' شوکت و مملکت' رفعت وعظمت کے مقامات بلند حاصل کئے تو وہ اتباع قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد قوم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر عجمی اسلام اختیار کر لیا تو اس کی حالت وہ وہ گئی جس کا ہم سب رونا رو رہے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن کی بلا سوچے سمجھے تلاوت سے ثواب مل جاتا ہے۔ یہ عقیدہ بطور قوم ہمارے لئے مہلک ثابت ہوا اور دنیا جہاں میں زوال ہمارا مقدر ہو کر رہ گیا۔ کاش ہم اس کتابِ ہدایت کو سوچ' سمجھ کر پڑھتے اور اس پر عمل بھی کرتے۔ آیئے اب دیکھتے ہیں اسبابِ زوالِ امت کے چند اشارے قرآنِ کریم کی روشنی میں:

(۱)   پھر ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنایا تا کہ دیکھیں تم کیسے کام کرتے ہو۔ (۱۴۔۱۳/۱۰)۔

(۲)   تمہارے ذمہ ایک عظیم فریضہ کیا گیا تھا۔ (۳/۱۰۳:۱۰۵)۔

(۳)   اور ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی۔ (۲/۱۶:۱۸)۔

(۴)   ان سے قطع تعلق کر لو۔ لیکن قرآنی تعلیمات ان کے سامنے ہر حال پیش کرتے رہو۔ (۶/۷۰)۔

(۵)   ان پر ہر طرف سے محرومی کی پھٹکار پڑے۔ (۳/۸۶)۔

(۶)   ان کے لئے دردناک عذاب کی زندگی ہوگی کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس حالت میں ان کی مدد کر سکے۔ (۳/۹۰)۔

(۷)   ان کی نیازیں' فدیئے اور خیراتیں نامقبول۔ (۳/۹۱)۔

(۸)   اس کے قانون سے انکار کرنے والوں کی آرزوئیں بارآور نہیں ہوسکتیں۔ (۱۳/۱۴)۔

(۹)   نبیؐ سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

(۱۰)   اللہ تمہیں ارتقائی منازل طے کرانا چاہتا تھا۔ لیکن تم پستیوں سے چمٹ گئے۔ (۷/۱۷۶)۔

(۱۱)   گمراہ ہوتے ہیں جو نظام خداوندی کی حدود سے نکل جائیں۔ (۲/۲۶)۔

بازآفرینی کی گنجائش۔

(۱۲)   پلٹ آؤ کہ نظام خداوندی کی آغوش رحمت وحفاظت تو کھلی ہے۔ (۳۹/۵۳)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایاز حسین انصاری

جشن آزادی

(یہ مقالہ 17 اگست 2003ء کو یومِ آزادی کے حوالہ سے ادارہ طلوع اسلام کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریب میں پڑھا جانا تھا۔ چونکہ وقت کی کمی کے باعث پورا مقالہ نہ پڑھا جا سکا اس لئے اسے طلوع اسلام میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

پاکستان کو وجود میں آئے 56 سال ہو چکے ہیں۔ اس سال ہم جشن منانے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس جشن کو جشن آزادی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں شبہ نہیں کہ اس دن ہم نے عوام کی حمایت سے قائداعظمؒ کی کوششوں کے ذریعے یہ خطہ زمین حاصل کیا تھا۔ یہ وہ قائد تھے جنہوں نے صدیوں کی لامرکزیت کی شکار قوم میں اپنے کردار کی پختگی سے وحدت فکر و عمل پیدا کیا اور مسلمانوں کو دنیا میں پانچویں بڑی مملکت دلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی یاد قائم رکھنا نہایت ضروری ہے تاکہ شعور ملی میں ہم اس انقلاب کو تازہ رکھ سکیں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

تشکیل پاکستان کے بعد قائداعظمؒ کے پیش نظر قرآن مجید کے احکام کی تعمیل میں پہلا اور سب سے اہم مقصد اس سرزمین کا تحفظ تھا۔ انہوں نے تمام تر توجہات استحکام پاکستان پر مرکوز کیں اور اندرون ملک کی تنظیم اور بیرونی خطرات کی مدافعت کے سلسلہ میں جو کچھ اس نحیف اور مریض شخص نے ایمان کے بل بوتے پر کیا اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ جس مہلک مرض کا شکار ہو گئے تھے اسے ایک راز کی طرح چھپا کر قلیل عرصہ کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ قائداعظمؒ کے فوت ہونے سے ملت پاکستان کو بڑا دھچکا لگا۔ مسلم لیگ قائداعظمؒ کی قیادت سے محروم ہو گئی تو مسلم لیگ کے ارباب حکومت نے شرمناک پلٹا کھایا اور اپنی زندگی کی گاڑی کو غلط پٹڑی پر ڈال دیا۔ عجیب افراتفری کا دور شروع ہو گیا۔

میرے عزیز ساتھیو! آج کا دن جشن منانے کا دن نہیں۔ اپنے احتساب کا دن ہے۔ ہم نے خطہ زمین تو حاصل کر لیا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ ایک حیران کن اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ 56 سال گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک ہم آزادی حاصل نہیں کر سکے۔ غلامی کے دور گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک ہم نے آزادی حاصل نہیں کی۔ غلامی میں چلے آ رہے ہیں۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ہم محکوم ہیں سرمایہ داروں کے، ہم محکوم ہیں زمینداروں اور جاگیرداروں کے، ہم محکوم ہیں مذہبی پیشوائیت کے۔

غیر مسلموں کے نزدیک آزادی سے مفہوم اس قدر ہے کہ غیر قوم کو ملک سے نکال کر ان کی جگہ اپنے ملک اور قوم کی حکومت قائم کی جائے یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کا قیام۔ قرآنی

تصور کے مطابق انسانوں کی حکومت خواہ وہ اپنی قوم کی ہو یا دوسری قوم کی ہو' بہرحال غلامی ہے۔ اگر کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو تو وہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ آزادی ہر انسان کا حق ہے۔ ہر انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور ہر انسان واجب تکریم ہے۔ حقوق تکریم اور عزت نفس کے اعتبار سے سب مساوی ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کے مطابق کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔

نو آزاد شدہ ممالک کے لئے مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غالب قوم طبعی طور پر تو ملک سے چلی جاتی ہے لیکن اپنے اثرات پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک بظاہر تو آزاد نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اپنی معاشرتی' معاشی اور سیاسی زندگی میں سابق قوم کی غلامی میں ہی رہتا ہے۔ وہ اپنے لئے کوئی دوسری نہج سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس مصیبت کو برقرار رکھنے کے لئے غالب اقوام اسے ہر طرح کی مدد دیتی ہیں تاکہ یہ نو آزاد ملک ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائے۔ غالب قوم مغلوب ملک کے صدیوں کے استحصال سے اپنے ہاں بے انتہا دولت اکٹھی کر لیتی ہے۔ وہ مغلوب قوم کی عادتیں اس قدر بگاڑتی ہیں کہ یہ قوم سہل انگاری کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اس قوم کا ان کی مصنوعات کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ اس سے مغلوب قوم کی محنت اور گاڑھے پسینے کی کمائی جو ان کی اپنی ملت کی نشوونما کے لئے ہونی چاہئے تھی مسلسل ان غالب اقوام کی طرف جاتی رہتی ہے جن کو Developed Countries کہا جاتا ہے۔ اس استحصال سے حاصل شدہ دولت سے وہ اپنے ہاں رفاہی مملکتیں Welfare States قائم کر لیتی ہیں اور اس سے اپنے نظام سرمایہ داری کے نقصانات کی کافی حد تک تلافی کا بندوبست کر لیتی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ وہاں کے لوگ سرمایہ داری نظام کے استحصال کے خلاف احتجاج نہیں کرتے۔ نو آزاد ملک اس چالاکی سے بے خبر رہتے ہیں اور اپنے ہاں وہ وہی سرمایہ دارانہ نظام قائم رکھتے ہیں جس کا نتیجہ عالم گیر بدعنوانی Corruption کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے۔ ہم نے اس مملکت کو حاصل ہی اس لئے کیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام زندگی کا نفاذ ہو اور یہ جانتے ہوئے کہ اسلامی نظام' سرمایہ داری نظام کا سخت دشمن ہے' اپنے ملک میں نظام سرمایہ داری نافذ کر دیا۔ اس ضمن میں ''اقوام غالب'' مذہبی جماعتوں کی مدد سے ''مذہب'' کے نام پر پراپیگنڈہ کروا رہی ہیں کہ نظام سرمایہ داری عین اسلامی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے لفظوں کا ہیر پھیر کر لینے سے جو کچھ اسلامی نظام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے' وہ دراصل نظام سرمایہ داری ہے۔ شور مچ رہا ہے کہ سود کو ختم کرو لیکن تجویز کرتے ہیں نظام سرمایہ داری۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب نظام سرمایہ داری قائم رہے گا تو سود کیسے ختم ہوگا؟ نظام سرمایہ داری کی بنیاد سود پر ہے۔ اس طرح قوم کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ سود صرف اور صرف قرآن کا معاشی نظام قائم کرنے سے ہی ختم ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے یہ تصور پیش کیا کہ جس طرح فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں' اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی کچھ غیر متبدل اصول و قوانین ہیں جو انسان کو وحی کے ذریعے ملے ہیں جو قرآن مجید کے دفتین کے اندر موجود و محفوظ ہیں۔ جن کی پابندی لازمی ہے۔ امت مسلمہ کی مملکت کا کاروبار ان اقدار و اصول کے تابع رہے گا۔

خدا نے جس قدر احکام و قوانین انسانوں کو دینے تھے' وہ

سب اس میں آ گئے اور یہ کتاب ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ اس میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت نہیں نہ ہی کسی کو اس کا حق حاصل ہے کہ ان میں کسی قسم کا تبدل وتغیر کر سکے۔ (18:27;6:116)۔ حتیٰ کہ رسولؐ کو بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں تھا (10:15) اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا (15:9)۔

قرآن مجید نے نوع انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری رہنمائی کے لئے ہے' حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں (12:40)۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو یہی محکم نظام حیات (دین) ہے۔ خدا اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (18:26)۔

یہ قوانین ڈاکٹیٹرانہ نہیں کہ خدا جو چاہے حکم دے دے۔ اللہ کی حکمرانی قانون کی حکمرانی ہوگی خدا نے اپنی حکمرانی کے لئے ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے جسے قرآن مجید کہا جاتا ہے۔ ضابطہ ہائے قوانین کیسے بھی منفرد اور مکمل کیوں نہ ہوں ان کی پوزیشن محض پند ونصائح کی کتاب ہے جب تک ''قوت نافذہ'' (حکومت) اس کے ساتھ نہ ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں' وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔ اسکا مقصد یہ ہوگا کہ حکومت کے ذریعہ اس دین (نظام زندگی کو) استحکام حاصل ہو جائے جسے ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن میں بدل جائے گا تاکہ نہایت اطمینان اور سکون سے صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کر سکیں۔

قرآن مجید نے تین انعامات خداوندی کا ذکر کیا ہے ا۔ خوف کی جگہ امن ۔۲۔ محفوظ ٹھکانا اور ۳۔ رزق طیب۔ اس نے بھوک اور خوف کو (لباس الجوع والخوف کو خدا کا عذاب کہہ کر پکارا ہے (116:112) ''قریش کو بھوک اور خوف سے نجات یاد دلائی ہے''

اطعمھم من جوع و امنھم من خوف

(106:4)۔ داستان بنی اسرائیل میں بتایا کہ اس قسم کا حقیقی امن۔ ٹھکانہ اور سامان زیست تمکن فی الارض سے میسر آتا ہے۔ امت مسلمہ کے ضمن میں بھی فرمایا کہ انعامات استخلاف فی الارض سے حاصل ہوتے ہیں جس سے دین (نظام خداوندی) متمکن ہوتا ہے اور اس کے تمکن کا نتیجہ حقیقی امن ہوتا ہے۔ لیکن اس سے اچھی طرح سے سن رکھو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی۔ اگر یہ لوگ اس شاہراہ حیات کو چھوڑ کر اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے وہ اس جنتی معاشرہ کی برکتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ برکات ایمان وعمل صالح کا نتیجہ ہیں اور جب ایمان وعمل باقی نہ رہا تو وہ برکات کیسے باقی رہ سکتی ہیں۔

اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ قوانین خداوندی کا نافذ کرنا ہے۔ امت کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔ معاشرہ میں عزت وتکریم کا معیار' جوہر ذاتی اور سیرت وکردار کی بلندی ہوگا' نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت وثروت۔ اس اصول نے ملوکیت کی جڑ کاٹ دی۔ انسان کو حقیقی آزادی حاصل ہوگئی اور سب کی مضمر صلاحیتیں ابھر اور نکھر آئیں۔ قوم کو ہمعصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل ہو

گئی۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں نے اصول سے انحراف کر کے ملوکیت کا نظام رائج کر دیا۔ جس کا نتیجہ شرف انسانیت کی تذلیل ابھر کر سامنے آیا جو استبداد ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے۔

حضور اکرمؐ نے پہلے ایک جماعت مومنین تشکیل فرمائی اور اس امت نے اپنی مملکت ان قرآنی اقدار و اصول پر قائم کی جسے اسلامی نظام حکومت کہا جاتا ہے۔ اس دنیا نے اس نظام کے انسانیت ساز نتائج دیکھے اور لوگ فوج درفوج اس طرف کھچے چلے آئے۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اپنی غفلت اور مفاد پرستی کی وجہ سے کچھ عرصے بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور امت زندان لعنت میں گرفتار ہوگئی۔ اسلامی نظام کی جگہ نظام ملوکیت نے لے لی۔ مسلمان خلفاء بادشاہ بن کر بیٹھ گئے اور مذہبی عقائد و رسوم مذہبی پیشوائیت کے حوالے کر دیئے۔ یوں دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ سیکولر نظام رائج ہو گیا۔ مذہب اور سیاست الگ ہوگئی۔ جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تو اس کے ساتھ ہی نظام سرمایہ داری بھی دوبارہ زندہ ہو گیا۔ مسلمان سلاطین نے کیا کیا' اس کا ذمہ دار نہ اسلام ہے' نہ صدر اول کے مسلمان۔ اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ان جرائم کی سزا اسلام کو بھگتنی پڑتی ہے اور مسلمانوں کو۔ غیر مسلم مصنفین (بالخصوص عیسائیوں) نے اس قسم کا پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ مسلمان دنیا کی وحشی ترین قوم خیال کی جارہی ہے۔

قرآن نے بتایا کہ انسانیت کو تباہ کرنے کے لئے تین لعنتیں ہیں۔ ملوکیت یا انسانوں کی حکومت (فرعونیت)۔ نظام سرمایہ داری (قارونیت) اور مذہبی پیشوائیت (ہامانیت)۔ قرآن نے ایک ایسا نظام قائم کیا جس میں ان تینوں کا وجود ختم ہو گیا۔ قرآن نے اس دور میں' جب ساری دنیا میں انداز حکومت ملوکیت تھا انقلابی اعلان کیا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اسے ضابطۂ قوانین' حق حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل گئی ہو' کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔ (3:79)۔ اس طرح اس ایک اصول کی رو سے ملوکیت یا اس طرح کی کوئی حکومت باقی نہ رہنے دی جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اس نے کہا کہ حکومت ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہ ہوگا لہٰذا یہ نظام تھیا کریٹک بھی نہیں ہوگا۔ امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورے سے' ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' اپنے معاملات طے کرے گی۔ اور یہ کہ کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف نہ ہوگا جو حق مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعہ عطا ہوئی ہیں۔ مسلمانوں نے اس اصول کے مطابق نظام حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجہ شادابیٔ عالم بن گئے اور دنیا نے دیکھے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے' یہ خدا کی رحمت کا صدقہ ہے جسے اس نے تمام اقوام عالم کے لئے عام کر دیا تھا۔ **(وما ارسلنٰک الا رحمة للعالمین)** دنیا' قرآنی اصولوں اور ان کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی کیونکہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کی تکمیل اس کے بغیر ناممکن ہے۔ مسلمان قوم نے' اس کے بعد اس اصول کو چھوڑ دیا اور انسان پھر تنہا عقل کی رو سے' ایک اطمینان بخش نظام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ انسانیت ہزاروں خونریزیوں اور فسادانگیزیوں کے بعد ملوکیت کے

نظام کے مقابلہ میں جمہوریت سے بھی مطمئن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظام اسلام سے زیادہ قریب ہے لیکن کیونکہ یہ نظام مستقل اقدار کے تابع نہیں اس لئے مکمل طور پر اسلامی نظام نہیں بن سکا۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاست دان مثلاً فرانسیسی مفکر Rene Guenn, پروفیسر الفریڈ کوبن' اٹلی کا مشہور مدبر' میزلی' پروفیسر بریفالٹ' مارٹن بوبر' ایک بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن' دانشور برفا وغیرہ اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔

اب آیئے زندگی کے اور اہم گوشے کی طرف یعنی معاشی نظام کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا مدار' زمین کی پیداوار پر ہے۔ جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس ذریعۂ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ چلا آ رہا ہے اور اپنی مقبوضہ زمین کی کاشت غلاموں اور مزارعوں کے ذریعہ کرا رہے ہیں۔ اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجۂ ذلت انسانی ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لئے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو۔ نظام مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری لے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کی بجائے مملکت کی تحویل میں ہوں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے تاکہ انسان رزق کی پریشانیوں سے آزاد اور محفوظ رہے۔ قرآن مجید نے ایک اور انقلابی اعلان فرمایا کہ:

--- ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ اور وہ تمام جانداروں کے لئے ہے۔

--- کسی انسان کے پاس زائد از ضروریات یعنی فاضلہ دولت نہیں رہ سکتی۔

--- کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ ہوس زراندوزی جیسی لعنت سے پاک ہو گیا اور عروج وارتقاء کی راہیں تیزی سے کشادہ ہوتی گئیں۔

قرآن کی حامل قوم امت مسلمہ نے ایسا معاشرہ متشکل کر کے دکھایا جس میں نہ کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم تھا اور نہ کسی کے پاس دولت کے انبار اور یہ ثابت کر کے دکھایا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے کچھ عرصے بعد سہل انگاری اور مفاد پرستی کی وجہ سے نظام کو ختم کر دیا اور نظام ملوکیت پھر رائج ہو گیا اور اس کے ساتھ سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ آ گئی۔

اب آیئے ہامانیت کی طرف۔ مذہبی پیشوائیت کا نظام' نظام سرمایہ داری' سیکولر نظام سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ سیکولر نظامِ سرمایہ داری میں سرمایہ دار کچھ سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کو غصب کرتا ہے۔ لیکن مذہبی سرمایہ دار ایک پیسے کا سرمایہ لگائے بغیر عوام کا استحصال کرتا ہے۔ عوام اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں اور منتیں کرتے ہیں کہ ان کی اس نذر محقر کو شرف قبولیت عطا فرمایا جائے۔ اس کاروبار کو برقرار رکھنے کے لئے یہ حضرات طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کی تخریب کاری کو بے نقاب کر دیا اور کہا۔

علماء و مشائخ (مذہبی پیشواؤں) میں سے جنہیں لوگ خدائی درجہ دیتے ہیں اکثریت کی حالت یہ ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال مفت کھاتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے راستے کی دعوت دیتے ہیں' لیکن درحقیقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستے کی طرف آنے نہ پائیں۔

اس راستے میں سب سے بڑی روک خود ان کا وجود ہے۔ اے رسولؐ! تم ان کے' ان علماء ومشائخ کو اور ان کے ساتھ' ان لوگوں کو جو (ان کی خود ساختہ شریعت کی آڑ میں' نظام سرمایہ داری کو منشائے خداوندی کے عین مطابق سمجھ کر) سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسان کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے' الم انگیز خبر سنادو (9:34)۔

نظام خداوندی کے دور میں اس مال کو' جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا (جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (70:17-18;104:6-7)۔ اور اس سے ان کی پیشانیاں ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جسے تم نے تنہا اپنے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو جو کچھ تم نے یوں جمع کر رکھا تھا اس کا اب مزہ چکھو (9:35)۔

ہر مذہب میں مذہبی پیشواؤں کو انسان اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے توسط کے بغیر خدا کی پرستش نہیں ہوسکتی۔ ان کی وساطت کے بغیر خدا تک نہ بندوں کے نذرانے جا سکتے ہیں' نہ ان کی دعاؤں کی وہاں تک رسائی ہوسکتی ہے۔ انہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

دنیا کے مذہب کا یہ عقیدہ اور مسلک ہے اور ان سب کے خلاف' قرآن کا انقلاب آفریں اعلان کہ جن کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا تک لے جانے والے راستے میں تمہارے قائد ہیں' درحقیقت اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہیں۔ جب تک انہیں راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا' تم خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ مذہبی پیشوائیت کے خلاف ایک اور جرم عائد کیا ہے کہ انہوں نے مذہب کو ذریعہ معاش (Profession) بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت ہے ہی معاشی مسئلہ۔ ان کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے تو یہ اپنے لئے ایک وقت کی روٹی بھی کما نہیں سکتے۔ آپ سوچئے کہ لاکھوں بے کار انسانوں کا انبوہ جو ملک کی پیداوار میں کوئی حصہ نہ لیں' اور پھر دوسروں کی محنت کی گھاڑے پسینے کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں ملک کے تباہی کا باعث نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

جب تک قرآنی نظام قائم رہا ان لعنتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو یہ تینوں عذاب یعنی فرعونیت' قارونیت اور ہامانیت' ملت پر پھر مسلط ہو گئے۔

یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں علامہ اقبالؒ نے قرآنی بصیرت سے نظام ملوکیت' نظام سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور فکری اور شعوری فضا ہموار کی۔ اس کے بعد الہٰ آباد کے مقام پر 1930ء میں مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں کہا کہ:

--- ''ہندوستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم' اشتراک وطن پر کی بنا پر ایک قوم کے افراد نہیں مسلمان فی زاتہٖ ایک الگ قوم ہیں اسے دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔

--- مسلمان اسلام کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں یہ قرآنی اصول واقدار حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کر سکیں۔''

ان دونوں شقوں کے مجموعہ کو نظریہ پاکستان کہا جاتا ہے۔ یہ تھا نظریہ جس کے مطابق پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اس مطالبہ کو تحریکی

شکل دینے کے لئے قائداعظم نے علم اٹھایا۔

اس تحریک کی مخالفت ہندو اور انگریز دونوں کی طرف سے ہوئی۔ ہندو انگریز کی مدد سے مسلمانوں کو غلام بنا کر ان پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ انگریز کو خطرہ تھا کہ اگر اس خطہ میں قرآنی نظام قائم ہو گیا تو اس کے سامنے اس کا امپیریل ازم اور سرمایہ داری پر مبنی نظام ٹھہر نہیں سکیں گے۔ اس لئے انگریز کا پلڑا ہندو کی طرف جھکا ہوا تھا۔ لیکن بے تیغ لڑنے والا سپاہی اللہ کے بھروسہ پر ان کے سامنے ڈٹ گیا جب مارچ 1939ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی تو قائداعظمؒ نے اس بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میں، انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم وستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو، ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔''

انہوں نے 1945ء میں پشاور کے ایک جلسۂ عام میں فرمایا:

''ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ خواہ وہ آپس میں متحد ہی کیوں نہ ہو جائیں۔''

اس زمانہ میں، چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسراقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لعل نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر نومبر 1941ء میں قائداعظمؒ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اپنی حفاظت کے لئے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریس راج رچایا جا رہا ہو گا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔''

کیا پاکستان کی تاریخ کے اندر اس سے بڑھ کر خودداری اور عظمتِ کردار کی درخشندہ مثالیں کہیں ملتی ہیں؟ ان کے پاس جذبۂ ایمانی کے سوا وہ کون سی قوت تھی جس کے بل بوتے پر انہوں نے سپر طاقتوں سے مخاطب ہو کر اس قدر جرأت کے ساتھ اس لہجے میں اپنا مؤقف دوٹوک الفاظ میں پیش کیا؟

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے نومبر 1945ء میں ایڈورڈ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''......ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔''

اگست 1941ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا

چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔'' (اورینٹ پریس بحوالۂ روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 فروری 1942ء)۔

پاکستان اس تحریک کی کہیں زیادہ شدید مخالفت ''علماء کرام'' حضرات کے گوشے سے ہوئی حالانکہ یہ مطالبہ اسلام کا مطالبہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء کی جمعیت العلماء ہند' انصار' احرار' جماعت اسلامی' سرحد کے سرخپوش وغیرہ سب اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ یہ حضرات کہتے تھے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام میں (جو مغربی جمہوریت کے اصول اکثریت کی رو سے غیر اسلامی تھا) ہمیں مذہب کی آزادی ہوگی۔ اس لئے ایک الگ خطۂ زمین حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان سے کہا جاتا کہ غیر اسلامی نظام کے تحت محض روزہ' نماز' حج کی آزادی کا نام اسلامی زندگی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی' اسلامی نظام ہی کے تابع ممکن ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کا قیام ضروری ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ یہی نقطۂ نزاع تھا اور ان کی اس روش نے اس تحریک کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ تشکیل پاکستان کے بعد وہ ادھر منتقل ہو کر آ گئے اور اپنے سابقہ موقف کی خود تردید کی۔

مسلم لیگ کا وجود 1907ء سے تھا لیکن اسے تحریک کی شکل قائداعظمؒ نے 36-1935ء میں دی۔ اس وقت مسلمانوں کا بیشتر طبقہ مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ حریت پسند طبقہ جو کانگریسی تھے وہ بھی قائداعظم کے ساتھ تھے۔ مولانا ظفر احمد خان صاحب کی اتحاد ملت پارٹی بھی مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔ الیکشن کے لئے جو پارلیمانی نیشنلسٹ علماء بمع مولانا حسین احمد مدنی' مولانا کفایت اللہ' جمعیت العلماء ہند (دیوبند) حریت پسند احرار سب قائداعظم کے ساتھ تھے۔ 1936ء میں الیکشن کا موقع آیا تو اس کے لئے پروپیگنڈا کی ضرورت تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا کفایت اللہ سے بات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اس کام کے لئے کم از کم پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی ان کو جب بتایا گیا کہ مسلم لیگ کے پاس فنڈ نہیں ہیں تو وہ لوگ یہاں سے اٹھ کر کانگریس میں چلے گئے۔ وہاں جا کر کہا کہ کانگریس تحریک عین مطابق اسلام اور مسلم لیگ تحریک غیر اسلامی۔ اس کے بعد افواہ اٹھی کہ بمبئی کے سیٹھوں نے ایک لاکھ روپے الیکشن کے خرچ کے لئے دیئے ہیں احرار جو انگریز کے دشمن مانے جاتے تھے انہوں نے کہا کہ یہ رقم بٹنی چاہئے۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ محض افواہ ہے۔ لیکن وہ نہیں مانے مسلم لیگ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مسلم لیگ نے ابتدائی اخراجات کے لئے امیدواروں سے پانچ سو روپے مانگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد پارٹی والے جن کے لیڈر مولوی ظفر علی تھے وہ بھی الگ ہوئے۔

ہندوستان میں انگریزوں نے اپنی حکومت قائم کی اور مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پبلک لاز اور شخصی قوانین۔ پبلک قوانین یعنی حکومت سے متعلق قوانین تو اپنی

ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین' شریعت کے مطابق طے ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست کو مذہب سے علیحدہ کر دیا۔ شخصی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کے حوالے کر دیئے اور یوں مذہبی دنیا میں تھیاکریسی (Theocracy) مذہبی پیشوائیت کی حکومت قائم کر دی گئی۔ قرآنی مملکت میں تو مذہبی پیشوائیت کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے قائداعظمؒ نے اعلان فرما دیا تھا کہ پاکستان تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنے گی۔

قائداعظم نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے' نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ:

''مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں......رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل' کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔'' (تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول صفحہ 48)

اس سے ان کی مراد' تھیاکریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے 11 اپریل 1942ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔'' (تقاریر جناحؒ' شائع کردہ شیخ محمد اشرف' جلد دوم' ص 386)۔

تھیاکریسی اسی طرح خلاف اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے' اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں' اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیت گورنر جنرل' فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا:

''پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدت انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔'' (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص 65)۔

ان تصریحات سے بالکل واضح ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا تھا تاکہ حقیقی اسلام کا نفاذ ہو اور اس کے درخشندہ نتائج ہمارے سامنے آجائیں اور ہم ہر میدان میں ترقی کر سکیں۔ مذہبی پیشوائیت کو یہ بات گوارہ نہ تھی۔ چنانچہ ان کی بہت بڑی تعداد پاکستان کی مخالفت

پر اتر آئی۔ مگر جب ان کی مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا اور قائداعظمؒ کے مندرجہ بالا اعلانات کے علی الرغم یہ سب کے سب پاکستان میں آ گئے اور اس خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے کہ جب یہاں اسلامی نظام کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو شرعی احکام و قوانین اور فیصلوں کے لئے لامحالہ مختار ناطق وہ ہی قرار پائیں گے۔ لہٰذا آتے ہی مطالبہ کیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے' اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کردو ورنہ ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دو کیونکہ وہ ہی اسلام کو جانتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ یہ بھی نہیں جانتے تو اسلام کیا ہے دیکھئے جسٹس منیر رپورٹ۔ تشکیل پاکستان کے بعد جتنی بھی حکومتیں آئیں ہر ایک کی پالیسی مذہبی پیشوائیت کے متعلق مصالحانہ اور مغلوبانہ ہے جس کی وجہ سے ان کی قوت بڑھتی گئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہماری آزادی کا قدم اول انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس لئے ہمیں الگ خطۂ زمین عطا ہو گیا تا کہ ہم اس میں دین کا نظام قائم کر سکیں۔ یہ محض احسان خداوندی تھا جس کا ذریعہ علامہ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت اور قائداعظمؒ کا حسن تدبر تھا۔ خطۂ زمین تو ہمیں مل گیا لیکن اس مقصد کے لئے ہم نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔

ہم نے اس خطۂ زمین کے لئے یہ کہہ کر استدعا کی تھی کہ ہم اس میں دین کا نظام قائم کریں گے۔ تا کہ اسلام کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا سکیں۔ لیکن ہماری سوختہ سامانی کہ یہاں جو روش اختیار کی اس سے اسلام کا رہا سہا بھرم بھی مٹ گیا۔ ہمنے دین کی نظام کی جگہ تھیا کریسی کا اقتدار بڑھایا اور اس کا نام رکھا' اسلام کا احیاء' اس سے اسلام دنیا میں اضحوکہ بن گیا۔ اس مقصد کے لئے یہ خطۂ ارض بطور امانت ملا تھا۔ ہم نے وعدہ وفا نہیں کیا اور اس امانت میں خیانت برتی۔ قرآن مجید اپنے عہد و معاہدہ کی شدت سے تاکید کرتا ہے۔ اس نے عہد و معاہدہ کو جو جیسے ایک انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کرتا ہے اسے ''عہداللہ'' کہہ کر پکارتا ہے (3:76)۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ عہد اور معاہدہ تم نے اس شخص کے ساتھ نہیں کیا تھا' خدا کے ساتھ کیا تھا۔ اس لئے تم سے خدا کے ہاں مواخذہ ہوگا **واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا** (17:34) اپنے عہد کو پورا کرو۔ اس کی بابت تم سے خدا کے ہاں باز پرس ہوگی۔ آیئے' پیشتر اس کے کہ ہماری ''اجل'' کی آخری سرحد آ جائے' ہم آج ہی ہم اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کا اقرار کریں اور دامنِ عجز پھیلائیں اور دعا کریں کہ اے پروردگار! ہمیں کچھ مزید مہلت دے دے کہ تجھ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کر سکیں اور پاکستان کے اندر اس قرآنی نظام کو پوری طرح نافذ کر سکیں جس کے لئے تو نے یہ خطہ زمین ہمیں عطا کیا تھا۔

یاد رکھئے قرنِ اول کی جماعت مومنین کے شرف و عظمت کا راز قرآن سے وابستگی کی وجہ سے تھا (43:43) لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؐ خدا سے کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو' اپنی خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے' اس قدر جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا (انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا) (سورہ فرقان' آیت نمبر 30)۔

پاکستان میں طلوع اسلام مسلسل قرآنی نظام کی نشاندہی

کرتا رہتا ہے وہ خالص قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت بھی بالخصوص مسلمانوں کے لئے ہی ہے جن کا قرآن پر ایمان ہے۔ طلوع اسلام کے سامنے اپنا کوئی مفاد نہیں۔ نام نمود کی بھی خواہش نہیں۔ اس کے باوجود اس کام میں مفاد پرست گروہ (یعنی سرمایہ داروں اور سرمایہ داری کی محافظ مذہبی پیشوائیت) کی طرف سے سخت مخالفت ہو رہی ہے۔ انہوں نے ایک متحد محاذ بنایا ہوا ہے۔ ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ دروغ گوئی اور بہتان تراشی روز کا معمول بن چکے ہیں۔

کیونکہ انکے پاس کوئی دلیل نہیں۔ یہ لوگوں کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ طلوع اسلام اور اس کا لٹریچر ہرگز نہ دیکھنا۔ اس سے تمہارے عقائد خراب ہو جائیں گے۔ عاقبت تباہ ہو جائے گی۔ یہ صرف اس لئے کہ کہیں لوگ عقل و شعور استعمال نہ کرنے لگ جائیں اور ان کے جھوٹ کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔

اتنی مخالفت کے باوجود اچھا خاصا طبقہ طلوع اسلام کے لٹریچر سے باخبر ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اور قرآنی تعلیمات کو اپنے ذہن میں اتار چکا ہے حتیٰ کہ دور دراز گوشوں میں بھی نہایت خاموشی سے قرآنی فکر پھیل رہی ہے۔ کوئی بھی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے ہر کالم میں آپ کو طلوع اسلام کا رنگ نظر آئے گا۔ ٹیلی ویژن پروگراموں میں بھی ملک کے دانشور جب دین کی بات کرتے ہیں تو وہ بھی تعلیمات پرویز سے متاثر نظر آتے ہیں۔ قرآنی فکر کو مزید پھیلانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اجتماعی اور منظّم کوشش کی ضرورت ہے۔ عوام قرآن کے لئے جذبہ اور تڑپ تو رکھتے ہیں لیکن ان کی اکثریت تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ ان کا سیاسی شعور بھی اتنا بیدار نہیں کہ وہ صحیح نظام کو سمجھ سکیں اور اچھے برے نمائندے کی تمیز کر سکیں۔ وہ اس قدر غریب و مفلس ہیں کہ روٹی کے دھندے کے علاوہ کچھ سوچ نہیں سکتے۔ ادھر مفاد پرست گروہ اس قسم کی تدبیریں کرتا رہتا ہے کہ عوام کا شعور بیدار ہی نہ ہونے پائے۔

پاکستان ایک آئینی مملکت ہے اس لئے یہاں دوسرا نظام یعنی قرآنی نظام لانے کا طریق بھی آئینی ہوگا۔ موجودہ جمہوری نظام میں اس امر کا بنیادی اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ جس قسم کا نظام چاہیں قائم کریں۔ آئینی تبدیلیوں کے لئے ضروری ہے کہ عوام میں قرآنی فکر عام کی جائے اس حد تک کہ ساری فضا قرآنی تصورات سے متاثر ہو جائے۔ مسلمانوں کے لئے اس ضمن میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے اس لئے کہ ان کا ایمان ہے کہ صحیح وہ چیز ہے جو احکام خداوندی کے مطابق ہو۔ غلط وہ چیز ہے جو ان کے خلاف ہو۔

قرآنی تعلیمات پھیلانے کے لئے تحریک طلوع اسلام کے پاس ماہوار مجلّہ طلوع اسلام' قرآنی تعلیمات پر مبنی علامہ غلام احمد پرویزؒ کی کتب' درس قرآن کے آڈیو ویڈیو کیسٹ اور اندرون ملک اور بیرون ملک بزمہائے طلوع اسلام ہیں جو قرآن کی روشنی پھیلانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ ہمیں امید واثق ہے بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان تو کیا پوری دنیا قرآن کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

آخر میں' میں اپنی بزمہائے طلوع اسلام سے درخواست کروں گا کہ اس وقت جب کہ پورا ملک مذہبی فرقہ واریت کی زد میں ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم آگے بڑھ کر عوام کو یہ بتائیں کہ اس جہنم سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے تھام لیں تاآنکہ نہ فرقے رہیں نہ فرقہ واریت۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم (2:127)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمت اللہ طارق

نقطۂ نظر

شماریات و منصوبہ سازی ابنِ خطاب کی نظر میں

تنظیم شہریت کے لئے منصوبہ بندی کا زمانۂ قدیم ہی سے رواج ملتا ہے کہ اس کے بغیر کسی بھی مملکت کے ذرائع استعمال کرنے میں جس دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا اس کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ غالباً اسلامی تاریخ کے پہلے حکمران تھے جنہوں نے اس طرف توجہ فرمائی اور منصوبہ بندی کے مطابق مریضوں محتاجوں، عمر رسیدہ لوگوں، بیواؤں اور نوزائیدہ بچوں کے وظائف مقرر کئے اور اسی منصوبہ بندی کے مطابق بیت المال کے نظام کو مستحکم بنایا اور اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اسلامی عملداری کا کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ یہ ان کا عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج اور از کار رفتہ مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہ بیت المال سے مقرر کی جائے۔ لاکھوں سے متجاوز فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے تنخواہ ملتی تھی اور یہ تمام کام خوراک رسانی کے امر کو آسان بنانے کے لئے آپ نے سرانجام دیئے۔ پہلے آپ نے حکم دیا کہ 25 سیر آٹا پکایا جائے چنانچہ تعمیل ہوئی اور تیس آدمیوں کو بلوا کر کھلوایا گیا پھر اسی طرح یہی عمل شام کو دہرایا اس طرح جائزہ لیا کہ آٹے کی یہ مقدار اتنے آدمیوں کی دو وقت کی خوراک کے لئے کافی ہے تو حکم دیا کہ ہر فرد کے لئے اس مقدار کا آٹا مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ منبر پر چڑھے اور پیمانہ ہاتھ میں لے کر اپنی زبانی لوگوں کو سمجھایا کہ اس پیمانے کی مقدار کے مطابق آپ سب آٹا آ کر لے جایا کریں پھر پیمانے کو لہرایا اور لوگوں سے کہا دیکھ لیں اسی کے مطابق وصول کرتے رہیں اگر کوئی اہلکار اس میں کمی کرے تو حکومت کو مطلع کریں۔ ایک شخص کے استفسار پر کہا کہ یہ مقدار غرباء و مساکین، آقاؤں اور ملازموں، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں ہے۔ اس ضمن میں آپ قرآن کی آیت میں واقع **انما الصدقات الفقراء والمساکین** کی تشریح فرماتے تھے کہ فقراء سے مسلمان اور المساکین سے غیر مسلم و دیگر لوگ مراد ہیں غرضے کہ مملکت کے غذائی امور صرف منصوبہ بندی اور شماریات ہی سے تکمیل پاتے تھے حتیٰ کہ جو گمنام بچے جنہیں مائیں شاہراہوں پر ڈال جاتی تھیں 18 ہجری میں ان کی پرورش کے لئے دودھ پلانے والی عورتوں کے مشاہرے مقرر کئے پہلے سال سالانہ 100 درہم مقرر ہوئے پھر سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا۔ اسی طرح یتیموں کی اگر جائداد ہوتی تو حکومت ان کی گارڈین بن جاتی اور ان کے اثاثے کو تجارت کے ذریعہ ترقی کا ذریعہ بنا دیا جاتا۔ ایک دفعہ حکم بن العاصؓ سے کہا کہ حکومت کے

پاس یتیموں کا جو مال ہے وہ زکوٰۃ نکالنے کی وجہ سے کم ہوتا جا رہا ہے تم اسے تجارت میں لگاؤ جو نفع ہو واپس دو چنانچہ اس وقت کے لحاظ یہ رقم دس ہزار درہم تھی آپ نے حکمؓ کے سپرد کر دی جو بڑھتے بڑھتے ایک لاکھ ہو گئی۔۔ 18 ہجری میں قحط پڑا آپ نے سرکاری گوداموں کی تمام گندم صرف کر ڈالی اور تمام صوبوں کو حکم دیا کہ گندم کی ترسیل شروع کر دیں چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے چار ہزار اونٹ اور حضرت عمروؓ بن العاص نے بحرِ قلزم کے راستے غلے کے بیس جہاز بھیجے اور ہر جہاز میں چھ ہزار من گندم ہوتا تھا یہ جہاز مدینہ منورہ حالیہ بندرگاہ ''ینبوع'' میں لنگر انداز ہوتے تھے۔ آپ نے قحط سے متاثرین کی فہرستیں تیار کرائیں چنانچہ ان کے نام اور غلہ کی مقدار کے رجسٹر تیار ہو گئے۔ مملکت کے میر منشی حضرت زیدؓ بن ثابت نے ہر ایک کے نام کی پرچیاں لکھیں اور ان پر خلیفہ عمرؓ کی مہر ثبت کی اور ہر قحط زدہ کو تقسیم کیں تاکہ وہ اگلے مرحلے پر اپنے کوٹے کی گندم آ کر لے جائے۔ اس کے علاوہ دارالحکومت میں روزانہ 20 اونٹ اپنی نگرانی میں ذبح کراتے اور پکوا کر قحط زدہ کیمپوں میں تقسیم کرتے لیکن یہ سب کچھ قحط کے ایام تک محدود تھا کہ مفت خوری کا اسلام میں نہ تصور تھا اور نہ ہی خلیفۃ المسلمین اس طرح کے قومی جرم کی حوصلہ افزائی فرما سکتے تھے چنانچہ اس کا انسداد کرنے کے لئے آپ نے ''مُحتسبوں'' کا تقرر کیا جو مفت خوری کی شرارت پر نظر رکھے ہوئے تھے جبکہ آپ خود بھی نظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک سائل کو دیکھا کہ اپنے تھیلے میں آٹا لئے جا رہا تھا آپ نے چھین کر اونٹوں کے آگے ڈال دیا۔۔ غرضے کہ آپ نے ایسے لوگوں کی سختی سے نگرانی کی جو کمانے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود وظائف کے دفاتر سے اپنی معاش حاصل کرتے رہے آپ نے ایسے لوگوں کے وظائف رکوا دیئے تھے فرمایا **ولا تکونو اعیالاً علی المسلمین۔** مسلمانوں کے خزانے پر ناجائز بوجھ نہ بنو (الاحکام السلطانیہ للماوردی، طبع مصر، ص 235)۔

منصوبہ بندی کے مطابق جن کے روزینے مقرر تھے بسا اوقات فہرستیں ہاتھ میں لے کر خود ہی ان کے ہاں پہنچ جاتے اور اپنے ہاتھ سے وظائف تقسیم فرماتے۔ بلکہ مکہ و مدینہ کے مابین ''قدید'' اور عسفان کے قصبوں تک جو دو چار دن سے کم سفر نہیں تھا پہنچ کر وظائف بھی پہنچاتے اور خیریت بھی دریافت فرماتے۔

ان چند واقعات سے اشارہ ملتا ہے کہ منصوبہ بندی اس وقت ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب شماریات کا نظام صحیح خطوط پر استوار ہو لیکن یہاں افتاد یہ ہے کہ ہماری شماریات ہی بدنیتی کے اتار چڑھاؤ کا ہدف بنی رہتی ہے۔ خاص کر ذخیرہ اندوزی اور بے ہنگم عائلی زندگی اس نظام کے لئے پیغام ہلاکت بنی ہوئی ہے بلکہ اسلام کے نام پر ہجرت وبال شماریات و منصوبہ بندی یقین جانئے آپ آبادی کے تناسب سے غذائی وسائل فراہم کر کے احتیاط کے بطور بیس پچیس لاکھ کی مزید آبادی کے لئے مزید اہتمام کر ڈالتے ہیں مگر ذخیرہ اندوز اپنی گھناؤنی سازشوں سے اصلی اور اضافی وسائل کو پانی میں بہا دیتے ہیں پھر سمگلنگ مستزاد۔ ان سمگلروں کی حیات آباد میں اربوں کی کوٹھیاں اور کھربوں کا مال گواہی دے رہی ہیں کہ ان پر ہاتھ ڈالنا کسی بھی حکومت کے بس کا روگ نہیں ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

من احتکر فلیس منا۔

جو غلہ یا ضروریات زندگی کی اشیاء کا سٹاک کرتے اور لوگوں تک پہنچنے نہیں دیتے یا فرصت پا کر مصنوعی قلت پیدا

کر کے گراں فروشی کا دھندا کرتے ہیں وہ ہماری مسلم سوسائٹی سے خارج ہیں۔

غور فرمائیے کتنی شدید قسم کی وارننگ ہے ان لوگوں کے لئے جو ذخیرہ اندوزی کو تجارت کہہ کر حرام خوری کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ وہ طمع' لالچ اور دولت سمیٹنے کی حرص میں دیدۂ بینا سے اس قدر محروم ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے مفاد کے سوا کچھ دکھائی دیتا ہی نہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔

المحتكر ملعون۔

ذخیرہ اندوز پر لعنت ہے۔۔

کاش جذبہ ایثار و قربانی سے فارغ ہمارے یہ بھائی ایسے کاموں سے احتراز کرتے جو موجب لعنت بھی ہیں اور وجہ مذمت بھی۔

ہم جانتے ہیں کہ ملک میں غذائیات کے بحران کو مستحکم کرنے والے اپنے مذموم عزائم سے باز نہیں آ سکتے کہ ان کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں اور وسائل بھی آہنی۔ وہ جانتے ہیں کہ لاہور میں گندم کی بوری اگر آج (15/3/97) کے دن -/650 روپے ہے تو پشاور میں اس سے -/200 روپے زیادہ مل سکتے ہیں اسی طرح یہی بوری جلال آباد میں -/1100 روپے اور کابل میں -/2000 روپے میں دی جاتی ہے۔ اس طرح خرید اور ٹرانسپورٹ اور پولیس کا بھتہ نکال کر بھی ذخیرہ اندوز کو کم از کم سمگلنگ کی برکت سے ایک ہزار صافی بچ جاتے ہیں۔ اب اسے کیا پڑی ہے کہ وہ قوم کے درد سے سرشار ہو کر اپنا دھندا ترک کر دے۔ یا نبی اکرم ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے رحمدلی' خدا ترسی یا اخلاقی برتری سے کام لے۔

ذخیرہ اندوزی کی طرح شماریات کے نظام کو تباہ کرنے کا دوسرا بڑا سبب عائلی زندگی کا عدم توازن بھی ہے۔ بچوں کی بہتات اور آبادی میں کئی گنا اضافے سے شماریات کا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ضیاء الحق نے دبئی اور کھوکھراپار کے راستے بیس لاکھ ایسے بھی آدمی جمع کئے جنہیں ایک گھنٹے میں شہری حقوق ادا کر دیئے گئے۔ اسی طرح اسلام کے نام پر پچاس لاکھ سے زیادہ لوگوں کو رہائشی حقوق دیئے جاتے رہے۔ جبکہ لوگ اتنی عالمی دھاندلی کو مذاق سمجھتے رہے اور مخالفت کو الٹا خدائی کاموں میں مداخلت کہتے رہے حالانکہ اللہ نے ہر شئے کے لئے ''تقدیری'' اور منصوبہ جاتی پیمانے مقرر کئے ہیں اور فرمایا۔

كل شئ خلقناه لقدر۔

ہم نے ہر شئے کے لئے پیمانہ (ومنصوبہ) بنایا ہے۔ (قمر'49)۔

نیز فرمایا:

لكل شئ قدرا۔

اس نے ہر چیز کیلئے اندازہ' تخمینہ اور منصوبہ بنایا ہے۔ (طلاق'3)۔

اور کہ

وخلق كل شئ فقدره۔

اللہ نے ہر شے کو پیمانہ تقدیر سے مربوط کر رکھا ہے (فرقان'2)۔

یہاں کوئی چیز بے ہنگم ہے اور نہ ہی تقدیری پیمانوں اور خدائی منصوبہ سازیوں سے ہٹ کر بنی ہے۔۔ اس طرح یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ ''معیشی''، تخمینوں' صحت و تعلیم کے منصوبوں اور مملکت کے دیگر ترقیاتی کاموں کے لئے شماریات کا سسٹم بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اور یہ نظام اس وقت ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب اسے فطری اصولوں کے مطابق پنپنے آزمانے اور چلانے کا موقع دیا جائے۔ کثرت اولاد جسے اللہ کا عطیہ سمجھا جا رہا ہے اس لئے نہیں کہ سینما کے بورڈ اٹھائے، ہیروئن فروشی کا دھندا کرے، حال سے بے حال رہے نالیوں اور گٹروں میں منہ دے کر حیوانیت کی سطح تک گر جائے، اخلاقیات سے بیگانہ ڈھوروں اور ڈنگروں کی سی زندگی بسر کرے، ایسی اولاد کس طرح اللہ کا عطیہ کہی جا سکتی ہے؟ اسے تو عطیہ کہنا ہی عطیۂ خداوندی کی توہین ہے۔ اگر کثرت اولاد ہی منظور فطرت ہوتی تو ایک مرحلے پر اس کی حد بندی کے اشارے کیوں دیئے جاتے؟ فرمایا:

وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة او.... ماملکت ایمانکم ذالک ادنیٰ الا تعولو۔

تمہیں اگر اندیشہ ہو کہ بیویوں کے مابین انصاف نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی پر اکتفا کرو۔ یا ماضی کی بیویاں جن کے تم مالک تھے انہیں کافی سمجھو کسی نئی کا خیال چھوڑ دو (اور) یہ ایک کی بات اس لئے ہے کہ تمہارا اعیال یعنی بچے بڑھنے نہ پائیں (نساء3)۔

اس آیت کا پس منظر باہر سے ڈھونڈ کر نہیں لایا گیا اس میں **ما ملکت** ماضی کا صیغہ مستقبل میں کثرت عیال سے مانع ہے اس آیت کے پہلے حصے **ان لا تقسطوا فی الیتامیٰ** نے خود ہی فراہم کر دیا ہے کہ۔۔ اسلامی جنگوں کے لئے عمر خطابؓ سے پہلے باقاعدہ فوجیں نہیں تھیں ہر شخص نفیر عام پر میدان جنگ میں پہنچ جاتا اور جان کی بازی لڑا دیتا تھا خاص کر زمانہ رسول علیہ السلام میں یہی حالت موجود تھی۔ ایسی حالت میں یتیم بچوں اور بیوہ خواتین کا بکثرت میسر آ جانا عین ممکن تھا ادھر ایمرجنسی کی اسی حالت کو دیکھتے ہوئے مسلم بے سہارا بچیوں اور بیوہ خواتین کو اپنے ہی اسلامی معاشرے میں کھپانے کے لئے احساس دلایا کہ مسلمانوں میں جو لوگ انہیں بسانا چاہیں تو دو دو۔ تین تین اور چار چار تک بصورت نکاح بسا سکتے ہیں تاہم ماضی میں جو کثرت ازدواج سے لطف اندوز ہوتے رہے انہیں اندیشہ ہو کہ نئی شرط پر پورے نہ اتر سکیں گے اور یتیم بچیوں کی حق ادائیگی پھر بھی نہ ہو سکے گی تو فرمایا انہیں چھوڑ کر دیگر عورتوں جن میں ان کی مائیں بھی ہیں ان سے شادی (مشروط طور پر) کر سکتے ہو۔

یہاں چونکہ اضطراری اور ہنگامی صورت حال نمودار تھی لہٰذا تعداد سے زیادہ بحث نہیں کی تاہم آیت کے آخر میں اشارہ دیا کہ بہتر ہے کہ ایمرجنسی اجازت کے باوصف صرف ایک سے شادی کر لو تا کہ "**وان خفتم**" کی حقیقت سے بھی بچے رہو اور کثرت اولاد کی مضرت کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے "**ذالک ادنیٰ ان لا تعدلواo**"۔

یہ بات کہ انسان زیادہ شادیوں کی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا قرآن پاک نے خود ہی واضح کر دی ہے فرمایا:

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم۔

تم شدید خواہش کے باوجود بھی مختلف بیویوں میں کسی طرح بھی عدل او توازن قائم نہ رکھ سکو گے (ولذ)۔۔ (نساء128)۔

اس طرح نساءؑ 128 نے خود ہی فیصلہ دے دیا کہ ایمرجنسی کی حالت میں جس تعداد کی اجازت تھی وہ خود بھی علی

الاطلاق نہیں تھی حالات مابعد از جنگ سے مربوط تھی کہ جنگوں میں عموماً مردانہ افرادی طاقت کھپ جاتی ہے اور نتیجہ میں صنف نازک کا بکثرت میسر آنا ممکن ہو جاتا ہے اور ایسی ہی صورت حال نمودار ہونے پر جن کے منہ میں شادیاں کرنے کی رال ٹپکتی ہے ذہن نشین کرایا کہ اولاد کی کثرت کی دوسری رکاوٹ کو فراموش نہ کریں۔ علامہ شہاب الدین آلوسی (854م) نساء(3) کی تشریح میں لکھتے ہیں **ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا۔** میں **"ذالک"** کا اشارہ **"فواحدہ"** کی طرف ہے یعنی ایک بیوی پر اکتفا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ عیال بڑھنے نہ پائے۔ (تفسیر روح المعانی، طبع مصر، جلد 27/196/4) بات صاف ہو گئی کہ ایک سے زائد بیویوں کی اجازت عام نہیں خاص حالات سے مربوط ہے اور وہ بھی نساء(128) کے تناظر میں حد بندی کے حصار میں آجاتی ہے اور وجوہات بتلا دیں کہ (الف) ایک سے زائد بیویوں کے مابین پوری احتیاط کے باوصف انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے دل ایک ہی سے اٹکا رہے گا اور (ب) ایک پر اکتفا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ بچے زیادہ پیدا نہ ہوں۔

یہاں نساء(3) میں **لا تعولوا۔** کے حرف نہی کے پیکر میں کثرت اولاد سے روکا گیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں (1889م) امام شافعی علیہ الرحمتہ کی زبانی فرماتے ہیں۔ **ان لا تعولوا اے لا یکثر عیالکم** ۔۔ یعنی **لا تعولوا** ۔ کے معنی ہیں تمہاری اولاد بڑھنے نہ پائے (نیل المرام، طبع مصر، ص 102)۔۔ امام شافعی (820م) کی طرح بڑے مجتہد جابر بن زید (745م) اور زید بن اسلم (753م) پہلے ہی **تعولوا۔** کے معنی کثرت اولاد کر چکے تھے بلکہ دانشوران ادب قرآن ابو عمر والدوری اور ابن الاعرابی (853م) نیز عول کے معنی کثرت اولاد کرتے اور ڈھیر بچوں کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ قرطبی (273م) نے بھی سلف میں سے امام شافعی کی رائے کو ترجیح دی ہے۔۔ کثرت اولاد کے نقصان کے بارے میں امام رازی (1210م) امام زمخشری (1144م) سے نقل کرتے ہیں کہ:

کثرت عیال سے بچنے کے لئے ایک شادی پر اکتفا کرنے کی فلاسفی یہ ہے کہ جس کے بچے زیادہ ہوں گے ان کی پرورش، تربیت (اور تعلیم) کا اہتمام کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی اور اس ذمہ داری کے معنی یہ ہیں کہ شخص مذکور کسب حلال پر قادر ہو جبکہ یہ نہ صرف مشکل ہے ناممکن بھی ہے (زمخشری کی یہ رائے نقل کر دینے کے بعد امام رازی متعدد بیویوں کے قائل ہونے کے باوصف امام شافعی کی رائے پر عش عش کر اٹھتے اور فرماتے ہیں کہ

زمخشری کی تشریح امام شافعی کے تناظر میں بالکل برمحل ہے بلکہ امام المسلمین شافعی نے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے کا درس دے کر ایسی وجہ سامنے رکھی ہے جو نہ صرف خوب ہے خوب تر بھی ہے **وفی غایۃ الحسن۔** (تفسیر رازی طبع مصر، 1938ء، جلد 178/9)۔

یہ تمام حوالہ جات اور فقہاء و مجتہدین کی آراء واضح کرتی ہیں کہ ان حضرات نے کثرت اولاد کے باب میں امام شافعی کی کھل کر حمایت کی ہے کیونکہ اگر آبادی پر کنٹرول نہ ہو سکے تو شماریات کا اصل مقصد بار آور نہیں ہو سکتا۔ جبکہ آپ شماریات کے بعد ہی نہ صرف غذائیات بلکہ ترقی کے تمام ذرائع کام میں لانے کے لئے منصوبے بناتے ہیں۔ جس میں ضبط تولید بھی ہے لیکن لوگ اگر تعاون نہ کریں اور اپنی غلط روش پر چل نکلیں تو ظاہر ہے کہ شماریات

اوراس کی اساس پرتمام ترمنصوبے فیل ہوکر رہ جائیں گے بلکہ اللہ کا حکم امتناعی **لاتعولوا۔** نیز بے مقصد ہوکر رہ جائے گا۔ العیاذ باللہ۔

نیز یہ کہ۔۔ نساء (128) ان لوگوں کے عزائم اور خواہش کے آگے دیوار بن کر واضح کرتی ہے کہ جو لوگ سہانے خواب دیکھتے اور خواب ہی خواب میں ان کے منہ سے رال ٹپکتی ہے کہ وہ کافر ادا حسیناؤں سے آغوش گرما کر دولت کونین کے مالک بن جائیں وہ نہ بھولیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ آیت کی ابتداء ہی میں بتلا دیا ہے کہ **ولن تستطیعوا** یہاں **"لن"** کے وہی معنی ہیں جو اردو میں ''ہرگزنہیں'' کے ہوتے ہیں یعنی تم شدید خواہش کے باوصف مختلف اصناف نازک میں انصاف ہرگز نہیں کر سکتے۔۔ اس کے جواب میں حدیث تیار کر لی گئی ہے کہ انصاف یا تقسیم حقوق میں مساوات' انسانی اختیار سے باہر ہے لہٰذا رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: اے اللہ جہاں تک حقوق میں مساوات کا تعلق ہے وہ تو میں بجالاتا ہوں باقی محبت میں مساوات؟۔ تو جانتا ہے کہ میں دل کے آگے بے بس ہوں۔ وغیرہ۔ یہ عذر بجا لیکن جس پیغمبر پر قرآن اتر رہا ہو وہ پیش نہیں کر سکتا اسے معلوم ہے کہ اللہ کے قانون میں پیار اور محبت کی مساوات ہی مطلوب ہے لہٰذا۔ **فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کا لمعلقة۔** مانا کہ دل کا جھکاؤ ایک ہی کی طرف ہوگا مگر نتیجہ ظاہر ہے کہ اس طرح دوسری تمہاری محبت کو ترس رہی ہوں گی لہٰذا ہمارا حکم ہے کہ **فلا تمیلوا۔** میلان قلب پر کنٹرول ہوا گر نہیں تو حقوق میں مساوات بھی ناممکن ہے۔ یعنی تعدادِ ازدواج فطری دھارے کے مطابق نہیں ہوسکتا۔

غور فرمایئے نساء (128) کی ابتداء میں **ولن تستطیعوا** کے ذریعہ عدم انصاف کی حقیقت واضح فرما دی اور آخر میں اس حکم یا حقیقت کو۔ **لا تمیلوا۔** کے کھلے حکم امتناعی سے مربوط کیا۔ اب یہ آپ کی سوچ پر منحصر ہے کہ قرآن کے واضح حکم کو ترجیح دیں یا مقابل میں قرآن شکن حدیث کو۔ والسلام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم چوہدری پرویز الٰہی صاحب وزیراعلیٰ پنجاب لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ'

عنوان : چند اہم ترین مسائل

آپ نے 4 اپریل 2003ء مری کے جلسۂ عام میں 20 کروڑ روپے کے ترقیاتی پیکج کا اعلان فرمایا بہت بہت شکریہ۔ اتفاق سے میں اس دن اپنی کتاب ''عزۃ القرآن'' کی کمپوزنگ کے سلسلہ میں لاہور میں تھا۔ آج آپ کی خدمت میں چند اہم ترین مسائل پیش کرتا ہوں جو عام طور پر او جھل ہیں۔

(1) باغبان ایسوسی ایشن میں ہر طبقۂ زندگی کے ممبران موجود ہیں۔ لہٰذا مجھے ان تمام کے مسائل کی نمائندگی کا حق ادا کرنا ہے۔ غریب طبقات کی بحالی میں سب سے اہم چیز بلاسود قرضہ ہے۔ جو کہ مسلمانی کا ایک وطیرہ بھی ہے۔ یہ حق سب کو دیا جائے۔

(2) مری۔ کوٹلی ستیاں اور کہوٹہ میں موجود مزارعین 200 سال سے آباد ہیں۔ انہوں نے بنجر زمینوں کو خود آباد کیا۔ اپنے مکانات خود بنائے۔ اب انہیں بے دخلی کا سامنا ہے۔ غربت ختم کرنے کے لئے 181 ارب روپے میں سے ان مزارعین کی بحالی پر بھی ضرور ایک حصہ خرچ کیا جائے اور شاملات دیہہ میں بھی ان کو حصہ دلایا جائے۔

(3) حکومت کچی آبادیوں کو مالکانہ حقوق دینے اور 5 مرلہ سکیم کے اجراء سے جو اصلاحات کرتی ہے۔ ان سے مری۔ کوٹلی ستیاں اور کہوٹہ کے مزارعین کو کچھ نہیں ملتا۔ بلکہ ان کی حق تلفی ہوتی ہے۔ وہ اپنی آبائی زمینوں اور آبائی قبرستانوں تک سے محروم کئے جاتے ہیں۔

(4) مری۔ کوٹلی ستیاں اور کہوٹہ میں دیمک کی تباہ کاریاں عروج پر ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد آج تک اس موذی کیڑے کو ختم کرنے کے لئے کوئی پروگرام نہیں بنایا گیا۔ دیمک کے گنبد نما گھرانوں اور زیر زمین گھرانوں کو تباہ کرنے والی ورکنگ ٹیم کے لئے 10 لاکھ روپے مخصوص کئے جائیں۔

(5) میدانی علاقے کی طرح مری۔ کوٹلی ستیاں اور کہوٹہ کے زمینداران کو شیشم کے مالکانہ حقوق دیئے جائیں تاکہ وہ اپنی عمارتی ضرورت اپنی زمین سے پوری کرلیں اور جرمانہ سے بچ جائیں۔

(6) تمام آبی مراکز پر نرسریاں قائم کی جائیں۔

(7) ایک صنعتی زون قائم کرنے کا جائزہ لیا جائے۔

ملک حنیف وجدانی۔ صدر باغبان ایسوسی ایشن' سنبل سیداں' نیو مری۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ق د ر

قدر کے بنیادی معنی ہیں اندازہ۔ پیمانہ۔ قدرت الشیء کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ماپا۔ اس کا اندازہ کیا۔ اس کی لمبائی چوڑائی جسامت، کمیت وغیرہ کو متعین کیا۔ بتایا کہ وہ کسی ہے، کتنی ہے، اس کا تناسب کیا ہے۔ اور قدر الشیئی بالشیئی۔ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر ماپا اور اس طرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں۔ یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے۔ قدرت علیه الثوب کے معنی ہیں اس نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ قدرت علیه الشیئی کے معنی ہیں میں نے اس چیز میں ایسی مناسب تبدیلیاں کر دیں کہ وہ اس پر بالکل فٹ آ گئی۔ لہٰذا تقدیر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا۔ اور مقدار اس پیمانے یا ماڈل یا (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے (تاج۔ محیط۔ لین۔ راغب)۔ قدر کے معنی ہیں کسی شے کا اندازہ۔ پیمانہ، حجم، جسامت۔ طول، عرض، وغیرہ۔ هذا قدر هذا کے معنی ہیں یہ چیز اس دوسری چیز کے اندازے، پیمانے، جسامت، وغیرہ کے بالکل برابر ہے۔ اس کے عین مطابق ہے۔ دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ جاء علی قدر کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا اور جاوز قدره کے معنی ہیں اس نے اپنے اندازے، حدود، پیمانے سے تجاوز کر لیا۔ اس سے آگے نکل گیا۔ اقدر اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی رفتار میں اس اندازہ اور توازن سے چلے کہ اس کے پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اس کے اگلے پاؤں پڑے تھے۔ قدار اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معتدل قد کا ہو۔ نہ زیادہ لمبا نہ چھوٹا۔ المقتدر۔ ہر چیز کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔ کم قدرة نخلك۔ تمہاری کھجوروں کے درختوں کے درمیان کس قدر معین فاصلہ ہے (تاج۔ محیط۔ لین۔ راغب)۔ عوام کی بولی میں المقدر اس شخص کو کہتے ہیں جو کھیتی اور درختوں کا اندازہ کر کے بتائے کہ غلے کی کتنی مقدار پیدا ہونے کی امید ہے۔ قدر۔ ہانڈی یا دیگ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قدور ہے۔ قدیر۔ اس گوشت کو کہتے ہیں جو (مناسب مسالوں کے ساتھ) ہنڈیا میں پکایا جائے۔ قدار۔ ایسا کھانا پکانے والے کو کہتے ہیں (نیز قصائی کو بھی) (تاج۔ محیط۔ لین۔ راغب)۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قدر اور تقدیر کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ۔ یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا۔ نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا۔ متوازن اور معتدل رہنا۔ ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے

قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے۔

(۲) چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو' اس لئے قدر کے معنی کسی چیز پر اقتدار واختیار رکھنے کے بھی ہیں۔ قدرت علیٰ الشیئی کے معنی ہیں مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔ مالی علیک مقدرۃ (یامقدرۃ۔یامقدرۃ یاقدرۃ) کے معنی ہیں مجھے تم پر کوئی اقتدار واختیار حاصل نہیں۔ اس بنا پر قــــدر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو تیار وہموار کرنے یا کسی معاملہ کو سرانجام دینے کے لئے اس پر غور وفکر کرنا۔ اسی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں (تاج۔محیط۔راغب)۔

(۳) ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولے یونہی دے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں۔ اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قدر کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو ماپ تول کر دینا (تاج۔محیط۔راغب)۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا (تاج۔محیط۔راغب)۔

سورہ رعد میں ہے۔ انــزل مــن الســمــاء مــاء فســالــت اودیة بقدرھا (۱۳/۱۷) اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قدر) کے مطابق بھر کر بہ نکلتے ہیں۔ یہاں سے قدر کے معنی اندازے یعنی ظرف اور پیمانہ کے واضح ہیں۔ سورہ حجر میں ہے۔ وان مــن شیــئــی الا عــنــدنــا خــزائــنــه ومــا نــنــزلــه الا بقدر معلوم (۱۵/۲۱)۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے ہاں خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہم اسے ایک متعین اندازے اور پیمانے کے مطابق باہر لاتے رہتے ہیں۔ سورہ سبا میں ہے کہ وحشی اقوام کے کاریگر' حضرت سلیمانؑ کے لئے منجملہ دیگر اشیاء قــدور راسیــت (۳۴/۱۳)۔ یعنی ایسی دیگیں جو ایک جگہ گڑی رہیں' بنایا کرتے تھے۔ یہاں قدر کے معنی دیگ کے ہیں۔

کسی پر غلبہ واقتدار حاصل کر لینے کے معنوں میں سورہ مائدہ میں ہے۔ مــن قبل ان تقدروا علیھم (۵/۳۴)۔ قبل اس کے کہ تم ان پر غلبہ حاصل کرلو۔ سورہ انبیاء میں ہے۔ فظن ان لــن نقدر علیه (۲۱/۸۷)۔ اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے۔ یا اس سے کوئی مواخذہ نہ کرسکیں گے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ان ربــک یبســــط الــرزق لــمــن یشــاء و یــقــدر (۱۷/۳۰)۔ یہاں قدر۔ بمقابلہ بسط آیا ہے۔ بسط کے معنی ہیں فراخی اور کشادگی۔ لہٰذا قدر کے معنی ہیں تنگی یا کسی چیز کا ناپا تلا ملنا۔

تقدیر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش۔ی۔ا) میں مشیت کے معنی دیکھئے اور ان تینوں گوشوں پر غور کیجئے جن کا وہاں ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ گوشۂ اول وہ ہے جہاں امر الٰہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد و ضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں۔ یہی قواعد وضوابط و خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ انہی کو ان کی ''تقدیریں'' کہا جاتا ہے۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے' نشیب کی طرف بہتا ہے' ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے

تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے۔ سورہ فرقان میں ہے خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا (۲۵/۲)۔ اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیئے۔ امام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الٰہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے۔ (جیسے سموٰات) اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

امام راغب نے جو پہلی بات کہی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گذرے ہیں اس میں وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر تقدیر کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قدر (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لئے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہود (Actualise) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔ مقدور۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنے پیمانے کے مطابق سامنے آتی رہے۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طُور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لئے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقیہ نہیں مل گئی کہ۔۔ آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔۔ اس کے لئے تمہیں شروع سے تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اس طرح تم مدین کی طرف آئے۔ اس طرح وہاں تم نے گلہ بانی کی۔ اس طرح تمہاری تربیت ہوئی۔ اور یوں ان مختلف منازل میں سے گذر کر ثم جئت علی قدر یموسیٰ (۲۰/۴۰)۔ تم' اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا (واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں کن مراحل میں سے گذارا جا رہا ہے اور کس مقصد کے لئے گذارا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ نبوت وہبی ہوتی ہے۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔) یہاں لفظ قدر نے اپنا مفہوم بالکل واضح کر دیا۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے۔ الذی خلق فسوی۔ والذی قدر فھدیٰ (۸۷/۲۰۳)۔ اللہ وہ ہے جو مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر ان میں مناسب اعتدال پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کے لئے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے اور ان کی اس راستے کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں۔ یہ ہے خدا کا نظام ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تقدیر تک پہنچتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی

ہیں۔لیکن اسے دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے اور چاہے دوسرا راستہ جس سے اس کی یہ صلاحیتیں دب کر رہ جائیں۔ان دونوں راستوں میں امتیاز‘ وحی کی رو سے ہوتا ہے۔(جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا‘ یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا‘ اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا۔جس طرح مثلاً جب تک پانی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالیت (Liquidity) کا قانون نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیت (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ ابتداء (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے۔چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم۔ (۶۱/۵)۔جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔دوسری جگہ ہے۔یوفک عنہ من افک (۵۱/۸)۔ اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے۔یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے‘ اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے۔اس لئے اس کے لئے تقدیرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے۔یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی اس کی ''تقدیر'' بن جائے گی۔اقبال کے الفاظ میں:۔

حرفے باریکش بہ رمزے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذر ہوا سازد ترا
سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی! افتندگی تقدیر تست
قلزمی! پائندگی تقدیر تست

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانون خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لو۔اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہو جائے گا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر
خواہ از حق حکم تقدیرے دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی روا است
زانکہ تقدیرات حق لا انتہا است

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقدیر کا مفہوم۔لہٰذا جب کہا جائے گا کہ ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لئے جا رہا ہے۔انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تقدیر) اس پر حاوی ہوگا۔اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے‘ اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے‘ خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جا سکتا۔ ان اللہ علیٰ کل شییء قدیر۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لئے پیمانے (قوانین، اندازے، تناسب، توازن) مقرر ہیں، علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے۔ یونہی اندھیر گردی نہیں۔ یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو اور (Ratio) قدر، پیمانے، اندازے، تناسب ہی کو کہتے ہیں۔ وکان امر اللہ قدرا مقدورا (۳۳/۳۶) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے۔ یہاں ہر بات (Rational) ہے۔ اندھی فطرت (Blind Nature) کارفرما نہیں۔ نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے۔ ''پہلے سے لکھا ہوا'' صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا)۔ انسان کی ''قسمت'' نہیں۔ اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانون مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قانون خداوندی کو قرآن کریم نے قدر کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قوانین جس طرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا (Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہیں۔ مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے یہی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ نزول قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے۔ اسی وجہ سے نزول قرآن کریم کی ''رات'' کو لیلۃ القدر کہا گیا ہے (۳-۱/۹۷)۔ وہ ''شب'' (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں۔ یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر، انسانیت کی سطح پر آتا ہے، اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie پڑتی ہے) تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ عندالضرورت، جان تک کو بھی۔ دین، نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

ہم کیسے مسلم ہیں؟

آج جو مسلمانوں کی حالت ہے اس پر دل کڑھتا ہے۔ ہم عجب مسلم ہیں۔ چاہے کوئی عربی ہو یا عجمی یا پاکستانی، سب صبح و شام، دن رات کلمۂ طیب پڑھتے ہیں کیونکہ اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کا مطلب وہ نہیں جو بچپن ہی سے ایک مسلم بچے کے ذہن میں راسخ کر دیا جاتا ہے اس لئے ہم اس صداقت کا عملی ثبوت دینے میں غافل ہیں۔ یہ نتیجہ ہے ہمارے ذہنوں میں اللہ کے قرآنی تصور نہ ہونے کا۔ ہمارے ہاں عام طور پر لا الہٰ الا اللہ کا ترجمہ "نہیں کوئی لائق پرستش سوائے اللہ کے یا نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔ اور انگریزی زبان میں There is no god but God یا There is no deity but God ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ تراجم دونوں زبانوں میں کلمہ طیب کے جز کا قرآنی مفہوم واضح نہیں کرتے۔ محترم ایڈیٹر صاحب یہاں میں آپ کے توسط سے کہوں گا کہ! کلمہ طیب نظریہ زندگی ہے۔ آئیڈیالوجی ہے۔ اس کی مثال سورۃ ابراہیم میں شجر طیب سے دی گئی ہے۔ یہ ایک عظیم پروگرام ہے۔ یہ کچھ کرنے کا کام ہے۔ نہ کہ کمرے کی بتیاں بجھا کر محض ذکر کی محفلیں جمانے، قلوب پر ضربیں لگانے یا آنکھیں بند کر کے ورد و وظائف کے لئے تا کہ وحی کی روشنی پاس نہ پھٹکنے پائے۔

قرآنک عربی زبان میں لغت کی رو سے لفظ اللہ (ال + الہٰ) کے معنی ہیں خاص صاحب اقتدار ہستی اور انگلش میں اس کا صحیح ترجمہ The Sovereign ہے۔ کلمہ کے اندر لفظ الہٰ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے کسی بت کے لئے نہیں ویسے یہ لفظ قرآن کریم میں بتوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے مگر جہاں جہاں یہ لفظ اللہ کے ساتھ آیا ہے وہاں اس کے معنی صاحب اقتدار و اختیار کے ہیں۔ اس لئے کلمہ کے معنی ہوئے دنیا میں خدا کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جسے اقتدار و اختیار کا حق حاصل ہو۔ اور انگلش میں اس کا ترجمہ There is no sovereign except Allah ہے۔ جب مسلمان اپنے کسی مسلم ملک میں دوبارہ نظام خداوندی (اسلامی حکومت) قائم کر لیں گے تو وہاں سے اس صداقت کا ثبوت ابھر اور نکھر کر ساری دنیا کے سامنے آ جائے گا کیونکہ اس اسلامی ملک میں انسانوں کی بجائے خدا (قوانین خداوندی) کا اقتدار Establish ہو گا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو گا نہ محتاج۔ یہی اسلام کے دور اول میں ہوا تھا۔ بعد میں کیا ہوا؟ یہ جگر پاش داستان ہے۔

(بشکریہ جنگ، لندن، 25 اگست 2003)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ثریا کوثر قیصرانی

گوہر ہائے آبدار

(پرویز علیہ الرحمہ کی تحریروں سے ماخوذ)

''ایسے علماء اور مفکرین جو نظری مسائل کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں میں لگے رہتے ہیں اور عملی نتائج مرتب کرنے والے امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں' قوموں کی تباہی کا موجب بنتے ہیں۔''

☆☆☆

''اتباع ہدایت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو خوف اور حزن نہیں رہتا۔ لہٰذا اگر کسی قوم پر خوف چھایا رہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہدایت خداوندی کا اتباع نہیں کر رہی۔''

☆☆☆

''سب سے بڑا جرم خود اپنے آپ سے خیانت کرنا ہے۔ یعنی جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ہو ان کے خلاف کام کرنا۔''

☆☆☆

''انسانی جسم کی پرورش ہر اس شئے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس' انسانی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔''

☆☆☆

''صحیح اطمینان علم و براہین ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اندھی عقیدت مندیوں اور توہم پرستیوں سے نہیں۔''

☆☆☆

''معاشرہ میں فرد کا مقام اس کی محنت کے اعتبار سے متعین کرنا چاہئے نہ کہ خاندانی یا اسی قسم کی دیگر اضافی نسبتوں سے۔''

☆☆☆

''گری ہوئی قومیں اپنی قوتِ بازو ہی کو ترک نہیں کرتیں' عقل و فکر بھی ساتھ ہی چھوڑ دیتی ہیں اور اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔''

☆☆☆

''ہم آہنگ ساتھی کا مل جانا' جنت ہے۔''

☆☆☆

''دل انہی کے ٹیڑھے ہوتے ہیں جو خود ٹیڑھے راستے پر چلنا

چاہتے ہیں۔''

☆☆☆

''قرآن کریم سے صحیح راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ادراک کا بے رنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔''

☆☆☆

''ڈپلومیسی کی باتیں قرآن کریم کی سیدھی اور واضح تعلیم کے خلاف ہیں۔''

☆☆☆

''اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں، اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں۔''

☆☆☆

''صبر کے (قرآنی) معنی ہیں اپنے پروگرام پر استقامت اور استقلال سے کاربند رہنا اور اس کے راستہ میں جو مشکلات آئیں ان کا ہمت اور استقلال سے اس طرح مقابلہ کرنا کہ پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ ....دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، نہ آگے بڑھ سکتی ہے، جب تک وہ (قرآنی مفہوم میں) ''الصابر'' نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ''صابر و شاکر'' ہو اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔''

☆☆☆

''علم حاصل نہ کرنا جرم ہے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد اپنی غلط روش میں تبدیلی نہ کرنا اس سے زیادہ سنگین جرم۔!''

''باطل کوئی نتیجہ خیز بات کر ہی نہیں سکتا۔''

☆☆☆

''کیریکٹر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو۔''

☆☆☆

''جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی وہ خارجی سہاروں سے مستغنی ہوتی جائے گی اور دوسروں کو سہارا دینے کا موجب بنتی جائے گی۔''

☆☆☆

''غیر قرآنی نظام میں قرب و بعد کا معیار، دولت اور وجاہت ہے۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں قرب و یگانگت کا معیار قلب و نگاہ کی ہم آہنگی ہے۔''

☆☆☆

''جب قومیں قوتِ عمل سے محروم ہو جاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید میں ہی عافیت سمجھتی ہیں۔''

☆☆☆

''تنہا عقلِ انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے تو اس نے ٹھوکر ہی کھائی ہیں۔''

☆☆☆

''حق کی باطل کے ساتھ آمیزش بھی جرم ہے اور حق کو چھپانا بھی جرم۔ حق کو ہمیشہ بلا آمیزش رکھنا چاہئے اور ظاہر کرتے رہنا چاہئے۔''

☆☆☆

''ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں جو انسان کے ذہن

تک محدود ہوں۔ ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے۔''

☆☆☆

''جو قومیں مستقبل کی پرواہ نہیں کرتیں وہ برباد ہو جاتی ہیں۔ یہی حالت افراد کی ہے۔''

☆☆☆

''آج دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ قومیں جو تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل وعلم کو وحی کے تابع نہیں رکھتیں۔ اور ہم اس لئے ذلیل وخوار ہو رہے ہیں کہ ہم نہ وحی سے مستفید ہوتے ہیں، نہ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔''

☆☆☆

''اگر انسانی جذبات وحی کے تابع چلیں تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے اور اگر وہ سرکش ہو جائیں تو اس کا نتیجہ جہنم کی پستیاں ہیں۔''

☆☆☆

''دنیا میں ایک دوسرے کے دوست، رفیق، ہمراز، ہمنوا وہی ہو سکتے ہیں جن کی منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کا راستہ ایک ہو۔ جن کی منزلیں مختلف اور راستے الگ الگ ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے دمساز اور ہمراز کیسے ہو سکتے ہیں؟''

☆☆☆

''ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری، تینوں بلائیں انسانیت کے لئے ہلاکت آفریں ہیں۔''

☆☆☆

''راستہ اسی کو بتایا جاتا ہے جو منزل تک پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاہے اور بھٹک جانے کی مصیبتوں سے بچنا چاہے۔''

☆☆☆

''قوموں کی ہلاکت کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ آرام پرست، کثرت کی طالب، تعیش پسند اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی مالک ہو جاتی ہیں۔''

☆☆☆

''مومن وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہو۔''

☆☆☆

''ایمان، خود یقین ہی کا نام ہے اور یقین، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تبصرہ نگار۔ثریا کوثر قیصرانی

نقد و نظر

''بزمِ آیات'' قرآنی الفاظ کی ایک ایسی جامع فہرست ہے جو قرآنی حقائق پر تحقیق و تفحص کرنے والے سعادت مند خواتین وحضرات کے لئے اس صورت میں بیش قیمت رہنما ہے کہ یہ قرآنی الفاظ و آیات کے استخراج کو نہایت سہل بنا دیتی ہے۔

کتاب کے مولف ڈاکٹر بشیر الحق (پشاور) اگرچہ پیشہ کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن قرآنِ کریم سے ان کا باقاعدہ تعلق کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔قرآنی فکر ان کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے طالب علموں کی مشکلات کو سمجھتے ہوئے ہر آیت کا انڈیکس تیار کیا ہے۔یقیناً یہ ایک ایسا کام ہے جو اندرونی لگن اور اپنے مقصد سے والہانہ عشق کے بغیر سرانجام پانا ناممکن تھا۔

قرآنی آیات یا موضوعات کے انڈیکس پر پہلے بھی کام ہوتا چلا آیا ہے۔اس میں جرمن مستشرق فلوجل کی مشہور کتاب ''نجوم الفرقان فی اطراف القرآن''، محمد فواد الباقی کی معجم المفہرس، علامہ پرویز کی تبویب القرآن اور لغات القرآن (قرآنی الفاظ کے مادوں کی فہرست)، میجر جنرل محمد نواز ملک کی 'مشمولاتِ قرآن'، مشتاق احمد کی 'کتاب عظیم' اور مقبول محمود فرحت کی 'مضامینِ قرآن' اپنے اپنے انداز کی مفید تالیفات ہیں۔

فنی لحاظ سے الفاظ قرآنی کے انڈیکس کی تیاری میں بعض حوالوں سے مزید کام کی ضرورت تھی۔مثلاً لفظ 'بعد' کی کئی ہیئتیں ممکن ہیں' **بَعْدِ' بَعْدُ' بَعْدُكُمْ' بَعْدُه' بَعْدِهٖ' بَعْدِهم' بُعْدِىٰ' بُعْداً' بَعْدِهَا' بَعْدَهَا' بَعْدِكَ** اور **بَعْدَهُنّ** کے لئے علیحدہ علیحدہ اشارات اکثر کتب میں نہیں ملتے لیکن ڈاکٹر بشیر الحق کی محنتِ شاقہ سے تالیف شدہ کتاب ''بزم آیات'' میں ان امور کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ مادہ یا مادہ کے اشتقاق کی بجائے قرآنی الفاظ کا جس شکل اور ہیئت میں قرآن کریم میں ورود ہوا ہے بعینہٖ اسی ہیئت کو برقرار رکھا گیا ہے۔اصل لفظ سے ماقبل یا مابعد کوئی حرفِ ربط یا ضمیر وغیرہ شامل ہو کر جو مکتوبی شکل بنتی ہے' اس کو بالخصوص ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔مثلاً ایک عام آدمی کے لئے لفظ **تواصوا** کو سمجھنا اور اسی بنیاد کر تلاش کرنا خاصا مشکل ہے لیکن لفظ **وتواصوا** سے قرآن کا ہر طالب علم آشنا ہے۔مولف کا اس زاویہ سے اشاریہ مرتب کرنا بلاشبہ قرآن کی بہت بڑی خدمت ہے۔مولف نے قارئین کی سہولت کے لئے کتاب کے پیش لفظ میں لفظ کے ذریعے ''بزم آیات'' سے آیت معلوم کرنے کا طریقہ بھی نہایت مختصر مگر جامع طور پر دے دیا ہے۔کتاب کی تکمیل اور طباعت کے ضمن میں مولف کو یقیناً ہمت فرسا مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔

کتاب کی ضخامت 622 صفحات ہے اور ٹائٹل رنگین (چار رنگوں میں) شائع کیا گیا ہے۔قیمت درج نہیں ہے۔

مولف سے رابطہ کا پتہ:

ڈاکٹر بشیر الحق۔افغان کالونی۔بلاک B' حسین خان سٹریٹ'

ٹیوب ویل چوک۔مین روڈ' پشاور شہر۔

ہمیں یقین ہے کہ مولف کی یہ کاوش قرآن فہمی اور قرآن پر تحقیق و تفحص کی منزلیں مزید آسان کرنے میں ممد و معاون ہوگی۔

FOR GOD SAKE

By

Aboo B. Rana

================

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

Miracles! What miracles? You will say, like most; nobody believes in them nowadays. Indeed, of course, in my narrations of them, you are likely to say, I am belittling all claims to rationality. We, who are living in this age of absolute rationality, will never be able to bring ourselves to terms with any unexplainable event. Numerous things are difficult to believe, a future life to name just one of them, is my case in point. Since none of us has ever come back, after taking departure from this world, to help us in resolving this enigma, so we conclude, there remains no sense in thinking about it. So far so good. As a matter of fact, let me put this question of future life in a different manner. When we were being formed in the womb, did we ever think, even once that we were going to, in future, become a part of this vast Divine Universe? The first primitive phase of our life we spent in that warm tiny cradle, for approximately nine months. Why must the journey of our life end with this world, if it did not end with our previous tiny world as a fetus, from which our umbilical cord was later lacerated? So what logic hampers, to believe, we are not already a part of another life to come? For miracles to happen, here is another one. Can anyone explain, how we are able to picture in our mind's eye, the face of any person, who is no more living with us? It is happening to us, this miracle, and every day of our lives. We are only beginning our familiarity with nature that is natural, to the nature that is supernatural, we pay little attention, which I believe, is the main cause of our disillusions. We leave supernatural phenomenon for the philosophers to think about.

The story of humanity needs more attention from the average mind and Muslims in particular, if we are to make any sense of this life. Otherwise, our sufferings will not only exist, but expand in volume with the passage of time. Bullheadedness has never lead to peaceful state of affairs, rather it only adds to more frustration, depression and destruction in the long run. The intellectually poor souls will enter this world on the whims of their parents and will make an exit, for no rhyme or reason. Where lies, in this kind of life, the elevation above the lower creatures? In these circumstances—must we leave matters wherever they are, or

should we change them, to help the growing child in us? Lines of words are all I have, for the present, to exchange views with you, to provide explanations, of the world that surrounds us. If we are suffering from lack of knowledge did I mention knowledge? I just wanted to be assured, it is not substituted for information. Information breeds mistrust, knowledge breeds hope. Wherever there is lack of knowledge, it becomes difficult to deny anything; neither can we make an assertion. We remain in limbo, like a person asleep, who can neither receive nor give anything. Devoid of any profundity, there is no way or means to reach the inner core, in this state of inertia.

There are matters, here in these lives that need to be resolved, for which we are going to be held responsible and accounted for. We may however, justify to ourselves, we did not create these problems. We were born with them. Someone in the remote past took a wrong turn, for which we are suffering. So why must God or anybody else hold us accountable? Very fine piece of reasoning, I must say. If this remains our attitude and lines of thought, then whichever person or generation solves the problems or struggles to solve must go to Heaven. Why do we ask for Heaven in our prayers, for which someone else worked for? Or putting it another way, if you walked the extra mile or made an extra effort for Allah, would you ask Him to grant the Heavens to someone else in your place? Gentle Hearts! We cannot have the cake and eat it too! The difference between ordinary and extraordinary is of adding only that little extra.

Here is yet another one. Listen to this. For the simple colds and headaches, we usually do not consult a doctor for medication. But only in prolonged instances and continued attacks of flu are we compelled to go to an expert or doctor for the treatment. The same holds true for nations. It so happens, when the whole community begins to suffer from mass anxiety, mass hysteria or mass depression, we do not consider it abnormal. As everyone around us looks in the same state of mind as we are; we falsely believe our condition as being natural. We even bring our sanctions from the clergy, since previously we consulted our clerics on every matter of life, considering them to be Mr. Know-All of God’s mysterious ways. In doing so, we forget these clerics are also a victim of the same mass mental ailment the rest of the society is suffering from. These same mentally ill clerics prescribe, to the simple folks, the overdose of the same religious rituals that are being perpetually misunderstood and are of no consequence. The public finding no cure, in old religious rituals which are meant to be performed in a system, becomes disillusioned and reactionary. Thereby, exhibiting mass hysteria, anxiety or depression, in the form of public strikes, agitations and other illegal non-conformist activities. It is in times like these we come to hear words like, “Islam is a used and fired cartridge!” A famous line, delivered, not by any ordinary man. And do not be surprised if I say it was Maulana Abul K. Azad. I need to stand corrected if my information is incorrect.

During the days when Sir Iqbal was fighting for freedom for the Muslims of the Indo-Pak subcontinent. You would like to say, the statement contains a modicum of truth, due to the fact that a layperson cannot find in the Quran or Hadith, any explanations for modern struggles, movements, warfare or the achievements of Man.

What in fact is needed at such times is an expert in mental sciences, a social psychologist or a social psychiatrist, to explain that it is professionally suicidal for anyone to involve in illegal practices. This virus grows like cancer in cultures. And killing people, who kill people, only to prove that killing will stop is senseless. We are simply replacing one killer with a bigger killer. Muhammad^PBUH^, Moses^PBUH^ or Jesus^PBUH^, never hated anyone, as far as I have read in history, not even their enemies who were against them. Neither did they incite their followers against their enemies. They forgave them and walked away from the situation, only disagreeing with their system of thought, and organized their own followers with new revelations from Almighty.

The irony of circumstances remains, we boff at ‘mental patients,’ ninety nine per cent of the times. We will go to consult doctors for every other impairment in our body organs, but when it comes to matters concerning the ‘mind’ or ‘psyche,’ we consider it a joke. And throw the matter aside, by calling the person or society as to have gone, nuts, crazy or whatever other term prevails. As if the brain is of no serious consequence. Mind they say, and they are right in saying, is a terrible thing to waste. Think! Even for a moment, please. The mind, that is, the nucleus or head quarters of our body—must it not need immediate attention and treatment in times of crises?

You may qualify your arguments; there is no relation that apparently exists in the Quran or Hadith in reference to modern discoveries. To be precise, about television sets and cameras. What has God or His Messenger to say on matters concerning automobiles, aero planes, cinemas, tape recorders, telescopes and the rest; in philosophical nomenclature, when the mechanical abracadabra is concerned? These machines were not invented yet, when Islam was being revealed. And what about cloning, organ transplants and other astounding and puzzling discoveries in medical sciences and fields of human engineering are concerned? These life styles of today did not exist in the times of any Messenger of God. Neither Messenger Muhammad^PBUH^ left for us any examples as to what must be done in times like now. These are modern day toys, discovered for the comfort and convenience of the human race. How must a modern day child relate with Hadith and the Quran in his day to day interaction with these mind boggling discoveries of science and engineering? There is no mention of them in the entire Islamology. The priest craft, who only know a few rituals, have failed to convince the innocent curiosity of a thinking child. The modern day child feels frustrated and rejected. Not being able to find a satisfactory answer, the child reacts by turning away from his teachers and parents. When there are no answers to his questions in the surroundings, the child begins to lose hope, in finding

a relation between religion and scientific discoveries. Eventually God begins to recede in the mind of this child, as He seems to have betrayed this child's sense of logic. The child feeling cheated and fooled by what is around is instigated to search for like-minded folks. In order to appease the zeal and enthusiasm for life, takes to whatever consumes his sense of excitement. With eyes full of tears, the now grown up child looks up towards God and says,

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

The values of Life, picked in the grand mother's lap, cannot be related to the materialistic world. The glitter and glamorous thrill benumbs the mind's eye. Religions beg leave from these dangerous attractions of the world. These do not allow the mind to get to the reality of matters. Just as the sun hides from us, the brilliance and shimmer of the immediate star; so are hundreds of worlds cradled in this vast Universe, hidden from our imagination, in the azure sky above us.

If the child is taught to take pains to learn; later in life, he or she has to learn to take pains again. Where remains the charm in Life? Is it to unlearn what we learnt in the rebellious age? It appears, a price is being demanded from us for rebellion. It is the social systems that generate rebellious individuals. And the same systems, later in life, ask a price for being rebellious. In the face of growing troubles, there is no room or charm left in life for the individual. The most puzzling of all philosophical questions attacks the common person. Must one transcend life, when it can be enjoyed at a cheaper price, as the system does not help him or her to overcome the habit of indulgence in cheap thrills? Or must one cry in life on losing a higher claim to Heavens or should we laugh at our own cowardice, by taking things on their face value? The irony is we do not even take things at their face value; we believe in fantasies and absurdities and then expect Allah's laws to address the issues!

It is very simple—if we continue to do what we were doing, we get what we were always getting. And when we sincerely want our lives to become better, we must change ourselves and think better. If previous systems of government are constantly wasting away human lives and do not qualify in fulfilling the standards of Life, must we not search for a new system that guarantees us safety and peace of mind? All those systems in past history only lead humankind to extremes; lethargy and life of luxury or tiring inhuman hard work, instead of balance.

In Natural system, when a child is born it is attended to by the parents. Before the child enters this world, there is milk in mother's bossom. In man made systems we have to struggle to live and have our peace of mind. And there is no promise if it will be achieved after an honest and sincere struggle is over.

آں خدا تانے دہد جانے دہد

ایں خدا تانے دہد جانے برد

They say the infant has to cry at least, when it wants to be fed. That happens with illiterate families; literate mothers know when to feed the child. All civilized individuals need two healthy meals a day, work, decent clothes to wear and a roof over their heads. Every child expects a smile on its parent's face at the end of the day, instead of daily bickering, before going to sleep. If only the governments of the Muslim world would decide to adequately pay the retired educated scholars on Islam, to do research and make laws that synchronize with Quran and true Hadith, instead of taking their knowledge with them in the grave, we could have better options. The present Islamic jurisprudence needs to be revised and rewritten with fresh knowledge of experienced Scientists, Medical doctors and Liars. I'm sorry, please accept my apologies, I meant to say Lawyers. By doing so, a ray of hope would erupt for our future generations. For God sake, forgive each other's mistakes, cast your personal prejudices and differences aside and put your heads together, not apart; if you all value Islam as the only true system of living.

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

It can be done. If it is not easy, it is not impossible too. If it could not be done, Allah the Creator of these universes would not have cared to mention it in the Quran. Are we sure the words of Quran in Chapter Al-Inaam verse 70 are not meant for us? Wherein it says, "And those who make fun of Deen, are deceiving themselves in this world; do not have anything to do with them… …!"

It is being said in clear words in chapter 4, verse 166 in Quran:

"Allah is witness; with **knowledge** this book is revealed unto you!"

Worldly wise too, is it not true, research is done on medicines in laboratories, when old medicines fail to cure a disease? Did not the founders of Pakistan, do research on Islam, got together and carve a place out for the Muslims of the sub-continent, against horrifying odds, in almost half a century? It was with knowledge they accomplished their mission. And that also with limited resources and without arms or guns. Nature has given us arms for hugging not mugging. Otherwise, how come, Allah Subhana'talla listened to the prayers of the founders of Pakistan and is now quiet to the prayers of the public of Pakistan? We must not forget, when clear water is made to stand in any pond for a lengthy period of time, it begins to stink. The same holds true with traditions of any society. A radical change in social and political laws is desperately needed, if we want a vibrant and dynamic culture. Covering copper jewellery with gold and silver will never radically change the reality of matters. We need laws and traditions that do not transform a natural individual into a

commercial commodity, to fit into the commercial market. We need rather a system, where individuals can fit in naturally. For that we must have a natural system, politically, economically and in the legislative.

Gentle hearts, Pakistanis are losing a rare opportunity, by not making compassionate enough and a viable Islamic system. Don't just read history please, for God sake, make history. Why can't those holding responsible and honourable posts, contribute their services with open hearts, avoiding past mistakes which mankind has made in its history? Instead of making people to ask alms from other nations. It is a matter of prime importance to be taken care of. The new system may not prove perfect initially. At least it shall be a step taken in the right direction for the life of humankind. Future generations, if not the present ones, will be thankful for helping them to grow in a natural environment. With all due respects to Sir Iqbal's poetry, allow me to say with a little change in his words,

جسے حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے
وہی چراغ جلے گا تو روشنی ہو گی

And that *chiragh* is the book of Quran. Otherwise might is right will remain the Law of this global jungle. And sophisticated looting shall remain the rule of this world. No amount of labour or material will consolidate any culture, society or nation, until the rust is not removed that is corroding its foundations. For a nation to survive peacefully, a compassionate legal system is indispensable. A system, in which no sincere heart feels cheated or deprived. And if we are going to wait for the right time to do it, then we will have to wait forever. That system can never be formed by our confused religious preachers, majority of them are devoid of true knowledge, and are adherents of dilapidated traditions and used clichés.

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلا کی اذاں اور مُجاہد کی اذاں اور

We desire, generally speaking, things to remain as we know them, not as they actually are. We want to read Quran, as it was being read by our fathers and forefathers. It cannot be so—there is more to it than we can imagine. Quran was not revealed for our fathers only, or to be crammed and recited only. It was revealed for all climates of opinion and for all humanity. It was meant to be studied, absorbed, understood and applied in our daily lives. The miracle of Quran remains, its meanings shall unfold with the growing knowledge of Mankind. Allah challenges human mind in the Quran, to create another of its like, that will encompass all ages--Past, present and future. And that is really, really a big challenge! Just think for a moment! Everything aside, to me the very word, Allah, completely baffles my senses.

The issue of finding a nexus between God's world and Man's world, is not, as most scholars of Quran believe, a preposterous enigma. In order to relate mankind's discoveries to life, we must be able to, first of all, define Life. Not as we want it, rather as it is—I lay no claims on being perfect, or being a saint. Like so many others, I have been a victim as well. Abused, deceived, hurt emotionally and physically, in an imperfect system. I beg you to forgive me if I sound blunt in my words. If no human is perfect, it does not stand to mean that all controversial matters must be left at the disposal of Almighty. That is why Sir Iqbal had to say,

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا ہے انساں بنا کے تقدیر کا بہانہ

Our problem remains, we want to play football and apply in it the rules of cricket. So we reach nowhere. The situation not only becomes absurd but ludicrous. Advancement in scientific achievements will not create advancement in the human situation. That is precisely what we are doing with Islam. We do what we want to do and expect the laws of Quran to help us. In order to run a train safely we must have rail tracks. To drive cars we need proper roads and obey traffic regulations. Where there are no traffic rules, we have traffic jams. The same holds true in human relations.

Real Islam is life giving, dear hearts, and not a life taking system. It is not about killing, it is about willing. And for heaven sake, do not serve each other to dominate life, serve to nominate life. Quran warns us again and again to fear Allah. Not because Allah is a monster. These words are reminders, so that we may not harm each other in any way, mentally, physically or emotionally. Allah's system nourishes and helps in producing a natural human being. On the contrary, modern systems encourage blind power. Power does not convert any individual into human. It manufactures savages. The game of Divine Life just like any other game cannot be played outside of certain rules and boundaries. First of all we must define Life and then make the rules and boundaries for living it. Man's mind has never been enough to define Life. It has never been and never will be. As man did not create Life. If we can genuinely understand the rules of living this Life from the Quran, we can apply them in our day to day interactions, and on modern day gadgets and discoveries sensibly. Nationally and Internationally. Those rules of politics, economics, sociology and other sciences, we all know, are present in the science of Islamology, hibernating in the true light of Hadith and Quran!

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے